اندازِ بیاں اور

راجہ
مہدی
علی
خاں

اچھی
کتاب
کا
نکھار
ہمیشہ
قائم
رہتا
ہے

اندازِ بیاں اور

راجہ مہدی علی خان

★

اَدَبی دُنیا۔ لاہور

ہماری دوسری کتابیں

رم آہو	عبدالحمید عدم	۴ء۰۰
زلف پریشاں	,,	۳ء۵۰
فروزاں	معین احسن جذبی	۲ء۰۰
سخن مختصر	,, ,,	۲ء۰۰
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۲ء۲۵
آفتاب داغ	مرتبہ قیوم نظر	۳ء۰۰
فریاد داغ	,, تمکین کاظمی	۳ء۰۰
انتخاب کلام ظفر	شاہد علی خاں	۳ء۵۰
۵۵ء کی بہترین نظمیں	حلقہ ارباب ذوق	۲ء۵۰
بن کپاسی (پنجابی)	پربھ جوت کور	۳ء۲۵
داغ فراق	شاد امرتسری	۲ء۲۵
درد کے پھول	صفدر میر	۶ء۰۰
صبح بہار	اختر شیرانی	۱ء۷۵
لالہ طور	,,	۱ء۷۵
اختر ستان	,,	۱ء۷۵
شہناز	,,	۱ء۷۵
طیور آوارہ	,,	۱ء۷۵
شہرود	,,	۱ء۷۵
غم بہار	ساغر صدیقی	۲ء۵۰
دیوان غالب	طاہر ایڈیشن	۳ء۰۰
حرف بشاش	نذیر احمد شیخ	۵ء۵۰
نالہ ہائے دل	یحییٰ عیش	۳ء۰۰
اقبال کے صنائع بدائع	نذیر احمد	۳ء۵۰

مفصل فہرست طلب کریں

آئینہ ادب چوک انارکلی لاہور

انداز بیاں اور

دور جدید کے جن شعراء نے زندگی اور سماج کے چھپے ناسوروں پر تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا، ان میں راجہ مہدی علی خاں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ وہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے خاندان سے تعلق رکھتے اور پیدائشی شاعر تھے۔ انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی شاعری کے لئے جو اسلوب اختیار کیا وہ انوکھا بھی ہے اور نرالا بھی۔

''انداز بیاں اور'' مرحوم کی ایسی ہی طنزیہ و مزاحیہ نظموں کا مجموعہ ہے، جن میں انسانی جہلت کے بعض حقائق طشت از بام کر کے خواب پرستوں کی ذہنی اڑان کو روکنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

محمد عبداللہ قریشی

سرورق : ہلالی

جملہ حقوق محفوظ

تعداد : ۱۱۰۰

۱۹۶۷ء

قیمت 450/-

[redacted]

اہتمام و سول ایجنٹس

م، ع سلام۔ آئینۂ ادب

چوک مینار۔ انار کلی۔ لاہور

(مطبوعہ اشرف پریس لاہور)

فہرست

۱	مقدمہ	از وینیتا آغا	۹
۲	میری نظموں کا دوست	از راجہ مہدی علی خاں	۳۶
	(طفل تسلیاں)		
۳	چوہے کی دعا		۴۸
۴	خرگوشوں کی غزل		۵۰
۵	چار بجے		۵۲
۶	بچوں کی توبہ		۵۴
۷	ننھی جگنی خدا کی تلاش میں		۵۶
۸	محترمہ مسز اُلّو اور اُن کے بچے		۶۱

(عہدِ جوانی ہنس ہنس کاٹا)

۹	نگوڑا	۶۴
۱۰	پھول اور کانٹا	۶۶
۱۱	بنتِ عم	۶۷
۱۲	درزن اور لارڈ کرزن	۶۹
۱۳	بھائی بہن	۷۵
۱۴	فیصلہ	۷۶
۱۵	آخری گالی	۷۷
۱۶	مولوی صاحب کا حجاب	۸۰
۱۷	ادیب کی محبوبہ	۸۲
۱۸	ضرورتِ رشتہ اور تصویریں	۸۵
۱۹	ایک اور ضرورتِ رشتہ اور تصویریں	۹۰
۲۰	غنڈے	۹۶
۲۱	ایک آنکھ والا	۹۸
۲۲	اُس سے اور اُسی سے	۱۰۰
۲۳	میاں کے دوست	۱۰۳
۲۴	بیوی کی سہیلیاں	۱۰۶

۲۵	شعراں کی جیل	۱۰۹
۲۶	دو ہمسائیاں	۱۱۴
۲۷	جلال نادہ	۱۱۷
۲۸	جمال نادہ	۱۲۱
۲۹	چاچا رحیم اللہ	۱۲۴
۳۰	میرے تکیوں پر لکھے ہوئے اشعار	۱۲۶
۳۱	ہمیں ہماری بیویوں سے بچاؤ	۱۲۸
۳۲	ونٹک نیم شب	۱۳۱
۳۳	مثنوی قہرِ عشق	۱۳۵
۳۴	ڈراما شیریں فرہاد	۱۳۹

(پھر ہم نے لیں آنکھیں کھول)

۳۵	مانگے کی کتابیں ——— واپسی پر	۱۴۴
۳۶	دو حرام زادے	۱۴۷
۳۷	بعد ڈاٹ انٹرویو	۱۵۰
۳۸	مُریدانِ باصفا	۱۵۲
۳۹	سوروں کی تجارت	۱۵۷
۴۰	مثنوی تاج دین معراج دین	۱۶۲

۴۱	اشنان	۱۶۷
۴۲	کلاہ پوش ـــ بہت بڑا آنسو	۱۶۸
۴۳	آسمان کا بلبلہ	۱۶۹
۴۴	ایک چلم پہ	۱۷۰
۴۵	پارٹیشن	۱۷۵
	(جنت میں بے چین رہے تھے، دوزخ میں آرام کیا)	
۴۶	پیر اور مرید	۱۷۸
۴۷	اجی پہلے آپ	۱۸۰
۴۸	اونگھ	۱۸۲
۴۹	میں اور شیطان دیکھ رہے تھے	۱۸۳
۵۰	جہنم میں غنڈے	۱۸۵
۵۱	جب شام جنت میں ہوئی	۱۸۷
۵۲	جنت میں حسینوں کی بھوک ہڑتال	۱۸۹
۵۳	شاعر خدا کے دربار میں	۱۹۶
۵۴	میرا دوست	۱۹۸

۵۵ -	مثنوی قہر البیان	۲۰۱
	رند کے رند رہے	
۵۶ -	خانہ بہ مہمان گذاشت	۲۳۸
۵۷ -	ایک اور مہمان	۲۴۲
۵۸ -	راجندر بیدی اور چور	۲۴۵
۵۹ -	حساب دشمناں در دل	۲۴۹
۶۰ -	رند کے رند رہے	۲۵۱

مُقدّمہ

زندگی کی کروٹوں سے تحصیلِ مسرت کا رجحان، حیرت، استعجاب اور تجسّس کے ایک شدید جذبے کے تابع ہے اور یہ جذبہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ناظر، زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک نئے زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بچّے کے لئے تحصیلِ مسرت کے امکانات زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف مظاہر کو جب پہلی بار دیکھتا ہے تو اُسے وُہ حیرت آمیز مسرت حاصل ہوتی ہے، جو زندگی کا متاعِ گراں بہا ہے۔ اِس کے برعکس ایک سے ماحول کو بار بار دیکھتے چلے جانے سے بے رنگی اور یکسانیت کا احساس پیدا ہوتا ہے جو مسرّت کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ فن کی دُنیا میں بالخصوص تکرار اور تتبّع سے یکسانیت اور بے رنگی مسلّط ہوتی ہے اور حظ یا مسرّت کی تحصیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر اچھا فن کار زندگی کو نہ صرف ایک نئے زاویے سے

دیکھتا ہے بلکہ اپنے فن کی مختلف منازل پر ہر بار ایک نئے زاویۂ نگاہ کو وجود میں لاتا ہے۔ نتیجتہً زندگی کے نوکیلے کنارے اس طور اُبھر آتے ہیں کہ نہ صرف خود فن کار اپنے عملِ تخلیق سے محظوظ ہونے لگتا ہے بلکہ ناظر کو بھی جمالیاتی حظ پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پس عام زندگی کے علاوہ فن کی دُنیا میں بھی مسرت کی تحصیل زاویۂ نگاہ کی تازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ضمن میں بچے کا طریقِ کار مسرت کے متلاشیوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

راجہ مہدی علی خاں کی نظمیں تحصیلِ مسرت کی جو ایک عمدہ مثال پیش کرتی ہیں، اس میں زندگی اور اس کی کروٹوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی وہ روش ہی نہیں ملتی جو بچپن کا طرۂ امتیاز ہے بلکہ زندگی سے مسرت اخذ کرنے کا وہ رجحان بھی ملتا ہے جو "بچے" سے مخصوص ہے۔ جہاں تک زندگی کے عام مظاہر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا سوال ہے، راجہ صاحب کے ہاں اس رجحان کے نقوش بہت روشن ہیں۔ اوّل تو یہی دیکھئے کہ نظم میں ان کا میدان سنجیدہ شعری تخلیق کی بجائے مزاحیہ تخلیق ہے اور مزاح کی نمو تازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ بے شک ایک سنجیدہ شعری تخلیق کی عظمت اس بات میں ہے کہ یہ گزرگاہِ خاص و عام سے ہٹ کر ایک نئی راہ تراشتی ہے تاہم اگر یہ نئی راہ نہ تراشے تو بھی کم سے کم گوارا اور قابلِ برداشت ضرور ثابت ہوتی ہے لیکن مزاح کی دُنیا کا انداز قطعاً نرالا ہے۔ مزاحیہ تخلیق

اگر ہنسی کو بیدار نہیں کرتی تو ناکامیاب ہو جاتی ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مزاحیہ تخلیق کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں — کامیاب یا ناکامیاب — کسی درمیانی منزل کا تصوّر ناممکن ہے۔ ایک لطیفے کا تجزیہ کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تمام تر کامیابی اس کے "اچانک پن" میں ہے۔ اسی لئے جب ایک بار لطیفہ سن لیا جائے تو دوسری بار سننے پر اس کا اثر باقی نہیں رہتا، نیز اگر لطیفہ کسی غیر معمولی کا احساس نہیں دلاتا تو ناکامیاب ہو جاتا ہے راجہ مہدی علی خاں نے اپنی نظموں میں مزاح کی تخلیق کی ہے اور انہیں اس خاص میدان میں جو کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ راجہ صاحب نے زندگی کے عام مظاہر کے چھپے ہوئے پہلوؤں پر روشنی کا ایک نیا پرتو ڈالا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے ایک ایسے نئے مقام سے گردوپیش پر نظر دوڑائی ہے کہ شے، کردار یا واقعہ کے مضحک پہلو سب سے پہلے ان کی نگاہ کا مرکز بنے ہیں، پھر جب وہ ان مضحک پہلوؤں کو ناظر کے سامنے پیش کرتے ہیں تو گویا مسرت کی تخلیق کرتے ہیں۔ اور ناظر ان کا ہم نوا بن کر ان مضحک پہلوؤں سے محظوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں اس مسرت کا بچپن کے ساتھ ایک گہرا تعلق بھی ہے۔ بچہ دو طرح کی مسرت تک رسائی پاتا ہے۔ ایک تو اُس مسرت تک جو حیرت و استعجاب کے باعث وجود میں آتی ہے۔ مثلاً جب وہ ایک خوبصورت پھول، جانور یا کھلونے کو حیرت سے دیکھتا ہے تو فرطِ مسرت سے ناچ اٹھتا ہے

دُوسری طرف بچّے کی مسرّت زندگی کے مضحک پہلوؤں سے تحریک پاتی ہے مثلاً جب وہ کسی شے کو ٹوٹتے، بگڑتے یا بدشکل ہوتے دیکھتا ہے تو بے اختیار ہنسنے لگتا ہے۔ راجہ مہدی علی خاں نے اپنی نظموں میں زندگی کے عام مظاہر کے مضحک پہلوؤں کو پیش کر کے مؤخر الذکر مسرّت کے حصول کے مواقع بہم پہنچائے ہیں اور اگرچہ ناظر کا ذوقِ مزاح بُلند تر حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم ناظر کی ہنسی ناہمواریوں کے وجود ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ ناہمواریاں بچپن سے متعلق بگڑی ہوئی یا بدشکل صورتوں ہی کا ایک ارتقائی روپ ہیں (ناہمواریوں سے تحصیلِ مسرّت کے اِس رجحان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا)

راجہ مہدی علی خاں کی نظموں میں پُرانی اشیاء کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے کا وہ رجحان ہی نہیں ملتا جو ناہمواریوں کو سطح پر لا کر تحصیلِ مسرّت کا موجب بنتا ہے بلکہ ان کے ہاں زندگی کے مظاہر، کیفیات اور عناصر سے مسرّت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی وہ روش بھی موجود ہے۔ جو اُردو نظم کی عام ڈگر سے ہٹ کر معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اُردو غزل میں غم، کسک اور نفی کا رجحان عام طور سے رائج رہا ہے اور اُردو نظم نے زیادہ تر (جدید دور سے قبل) نظریات کی تبلیغ کے لئے ایک حربے کا کام دیا ہے۔ البتہ جدید نظم میں "اندر" کی دُنیا سے متعارف ہونے اور داخلی غم کو سطح پر لے آنے کا وہ رُجحان اُبھر آیا ہے، جواب تک صرف غزل سے خاص تھا۔ اور نتیجۃً اُردو نظم نے ایک ہی جست

میں فن کی بہت سی منازل کو طے کر لیا ہے۔ شاید یہ ہمارے مخصوص فلسفیانہ افکار کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں فراوانی کے باوصف زندگی کی نفی کا رجحان مسلط رہا ہے اور فرد نے ارضی عوامل سے قطعِ نظر کر کے حیاتِ جاوید کی تلاش میں اپنی تمام تر مساعی کو وقف رکھا ہے۔ زندگی بعد از موت کے تصوّر کی مقبولیت کی وجہ غالباً یہی ہے۔ پھر حیاتِ جاوید کی تلاش میں زندگی کی عام مسرّتوں اور رعنائیوں سے کنارہ کش ہونے کا جو رجحان اُبھرا اور جسے ہمارے مخصوص فلسفیانہ اور مذہبی نظریات نے فروغ دیا، خود ہمارے ادب، بالخصوص شاعری پر بھی اثر انداز ہوا اور ایک ناآسودگی، غم اور خلش نے ہماری اصنافِ شعر بالخصوص غزل میں مستقل جگہ بنا لی۔ اِس پس منظر میں راجہ مہدی علی خاں کی نظموں کا مطالعہ کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر نے زمینی مسرّت کی نفی کرنے کی بجائے ایک مثبت طریق کار کو حرزِ جان بنایا ہے اور زندگی کے مظاہر سے کنارہ کش ہو کر اپنی ذات میں سمٹنے کی بجائے زندگی کے مظاہر کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ عظیم شاعری دردمندی اور غم کی پیداوار ہے اور اسی لئے بذلہ سنجی (WIT) کی شاعری کو فن کے زینے پر کوئی بلند مقام حاصل نہیں۔ تاہم یہ شاعری فرد کو زندگی اور اس کی مسرّتوں سے قریب تر لانے کا جو ضروری فریضہ سرانجام دیتی ہے اس کی اہمیت کسی طور بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی۔ ایک تو یہی دیکھئے کہ یہ عمل

ذہنی اور جسمانی صحت پر دال ہے اور ناظر کو ایک صحت مند نقطۂ نظر سے آشنا کرتا ہے۔ دوسرے فن میں زوال اُس وقت نمودار ہوتا ہے، جب وہ اپنے ابتدائی مراحل پر پہنچنے کے بعد اپنے منبع یا زمین سے منقطع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زمین اور اس کے مظاہر سے رشتہ قائم رکھنے کی یہ روش (جسے راجہ مہدی علی خاں نے پیش کیا ہے) فن کی سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ یہ فن کار کو اپنے پس منظر سے ناآشنا نہیں رہنے دیتی اور اس کے فن میں اردگرد کے ماحول کا شعور سدا موجود رہتا ہے۔

راجہ مہدی علی خاں کے ہاں مسرت اخذ کرنے کا رجحان اُن نظموں میں بہت نمایاں ہے جو عورت اور مرد کے ربط باہم سے متعلق ہیں۔ اس ربط کے سلسلے میں شادی سے قبل کی جذباتی محبت اور شادی کے بعد کی غیر جذباتی مسکین ہمدردانہ وابستگی کو راجہ صاحب نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور اپنی مخصوص افتادِ طبع کے زیرِ اثر اس ربط کے اُن پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی ہے جو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور ناہمواریوں سے متعلق ہیں نہ کہ اُن پہلوؤں کو جو ناآسودگی، غم اور محرومی کے باعث ایک انوکھی شدت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طرح سے دیکھیں تو اس میں انسان کی عظمت بھی ہے کہ وہ اپنی جذباتی کیفیات سے خود کو الگ تھلگ کر کے ان پر ایک نگاہ ڈالے اور پھر ہنسنا شروع کر دے۔ لیکن اِس طریقِ کار کی دو صورتیں

ہیں۔ ایک تو غالب کا سا انداز جہاں مزاح ایک شدید یاسیت اور احساسِ محرومی سے تحریک لیتا ہے اور ایک ایسی صورتِ حال کو معرضِ وجود میں لاتا ہے جہاں آنسو اور تبسم ایک دوسرے سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ یہ فن کی معراج ہے۔ دوسری صورت ایک ایسے باشعور انسان کا طرزِ عمل ہے جو جذباتی روابط کی ناہمواریوں کو پا لیتا ہے اور پھر ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ ان کی نقاب کشائی کرنے لگتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا یہ صورتِ حال راجہ مہدی علی خاں کے کسی شعوری عمل کا نتیجہ نہیں، بلکہ اُن کی افتادِ طبع اور ایک مخصوص زاویۂ نگاہ کی پیداوار ہے۔ وہ اس طرح کہ راجہ صاحب کے ہاں ایک بچّے کی سی معصومیت اور کھلنڈراپن ہے۔ جس کے تحت وہ زندگی سے ہم کنار ہوتے اور اس کے مظاہر کے ساتھ گویا "آنکھ مچولی" کھیلتے چلے جاتے ہیں۔ اِس طرزِ عمل نے محبت کے موضوع کے سلسلے میں ان کی نظموں پر گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ اور محبت کی طرف ان کے ردِّ عمل کو اس طور متاثر کیا ہے کہ اس میں ہنسی، چہل، خوش باشی اور محبت کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا رجحان اُبھرا ہے نہ کہ محبت کے غم میں ڈوبنے اور دنیا جہان سے الگ تھلگ ہو کر محبت کی کربناک کیفیتوں کو سینے سے لگانے کا رجحان۔ چنانچہ ان کی اس قسم کی نظموں میں لڑکے اور لڑکی کی محبت تخئیلِ مسرت کی ایک دلچسپ مثال پیش کرتی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اس

طرح تو پھر راجہ صاحب کی پیش کردہ "محبت" میں سستا پن ہے جو کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں لیکن درحقیقت بات اس سے قدرے مختلف ہے۔ اگر تو راجہ صاحب محض دو نوجوان دلوں کی محبت کے چند سطحی پہلوؤں تک محدود رہتے تو اعتراض جائز تھا لیکن یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ راجہ صاحب نے ان سطحی پہلوؤں کو پیش کرتے وقت محبت کی جذباتیت کو مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ محبت کی ناہمواریوں کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ جذباتی کیفیات مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہیں اور ناظر، شاعر کے، شرارت بھرے تبسم کا سہارا لے کر ہنسنے لگتا ہے۔ کورٹ شپ کے ایام سے متعلق راجہ صاحب کی یہ چند نظمیں دیکھیے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے محبت کے پُر مسرت پہلوؤں کو ہی زیادہ تر اپنی نگاہ کا مرکز بنایا ہے اور محبت کی اُن کربناک کیفیات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش نہیں کی جو فراق، ناکامی یا حادثے سے وجود میں آتی ہیں۔ اور یہ شاعر کی اُفتادِ طبع کے مطابق بھی ہے:-

تو بھی جا کوٹھے پہ سوتن میں تو بس اب جاچکی
توبہ توبہ کون واں جائے گا میں باز آچکی
جب بھی میں اوپر ہوں جاتی
سامنے اُس کو ہوں پاتی

وہ نگوڑا مجھ کو تنگ کر جانے کیوں کرتا ہے ہائے
اب کہو سوتن کوئی کیا خاک اس کوٹھے پہ جائے
دس دفعہ میں کل گئی جب
کیا بتاؤں اُف مرے رب
دس دفعہ ہی مَیں نے پایا اُس کو اپنے سامنے
مجھ کو تک تک کر دگا کم بخت دل کو تھامنے
آ ذرا کوٹھے پہ جائیں
آ دہی یہ چنری سکھائیں
اُس نگوڑے مردوے کو مُنہ لگائیں گے نہ ہم
وہ جدھر ہوگا اُدھر چنری سکھائیں گے نہ ہم

"نگوڑا"

سرور:- اِدھر دیکھیے اک نظر بندہ پرور
کرم کو تشریف لائے ہیں سرور
ذرا اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا کر
ہمیں دیکھیے اک نظر مُسکرا کر
مشینوں پہ کپڑے سئے جا رہے ہیں
رُدالوں پہ بخیے کیے جا رہے ہیں

جھیز اپنا سینا اری اے حسینا
مگر میرا چاکِ گریباں نہ سینا
نگاہیں اُٹھا کر اِدھر دیکھ درزن
کھڑا ہے ترے سامنے لارڈ کرزن

رضیہ :۔ چلو چھوڑو مسٹر یہ بکواس کینک
تم اِس گھر میں تڑپو گے بے آس کینک
کبھی لڑکیاں ویسے پھنستی نہیں ہیں
ہنساؤ تو بے درد ہنستی نہیں ہیں

سرور :۔ مچلتا رہوں کب تلک دُور رہ کے
قریب آؤں میں ایک دو تین کہہ کے؛

رضیہ :۔ کم از کم رہو سو قدم دُور مجھ سے
چپت ورنہ کھاؤ گے بھرپُور مجھ سے
چلے آئے پھر عشق کا ساز لے کر
بلاؤں میں امّی کو آواز دے کر؛ وغیرہ

———— درزن اور لارڈ کرزن

لڑکا :۔ نہیں آتی تو کیا ہے، ہم تمہیں انگلش پڑھا دیں گے
کتابیں مت منگانا سب کی سب ہم کل ہی لا دیں گے

لڑکی :۔ نہیں اس کی ضرورت کیا ہے یہ تکلیف مت کیجے
مناسب ہے یہی بی اے کا پہلا امتحاں دیجے

لڑکا :۔ کسی کی فکر میں کیوں آرہے تم کو پسینے ہیں
ابھی تو امتحاں میں ٹھیک پونے نو مہینے ہیں

لڑکی :۔ بہت رہتی ہے چیخم دھاڑ سب بچوں کی اس گھر میں
پڑھے گا خاک کوئی اِتنا واویلا ہو جس گھر میں

لڑکا :۔ ارے ہر شام کُنجِ باغ میں ہم بیٹھ جائیں گے
اُٹھے آندھی یا طوفاں ہم تمہیں انگلش پڑھائیں گے

لڑکی :۔ اجی چھوڑو یہ باتیں اپنا دل تم کھو چکے ہو گم
کہو نا صاف اِ مجھ سے عشق کرنا چاہتے ہو تم!

———— "بنتِ عم"

لے کے اپنی اداؤں کے لشکر	وہ دبے پاؤں گھر سے آتی ہے
چاند حیرت سے اُس کو تکتا ہے	سوچتا ہے کدھر یہ جاتی ہے

گلستاں کی حسیں ہواؤں میں	اُس کی ہر اک مراد کھلتی ہے
دن میں کہتی ہے جس کو وہ بھائی	رات کو چھپ کے اُس سے ملتی ہے

———— "بھائی بہن"

ان نظموں کے مطالعہ سے ایک تو یہی خیال پیدا ہوتا ہے (اوپر اس کا ذکر ہوا) کہ راجہ صاحب محبت میں ہنسی، چہل، مذاق اور مسرت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ دوسرا احساس یہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ خود ہی اس محبت کو مذاق کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ مثلاً "نگوڑا" میں انھوں نے چھڑی سکھانے کے بہانے کو مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ اسی طرح "بنتِ عم" میں محبت کی جذباتی سطحیت کو اُجاگر کیا ہے۔ ناظر ان نظموں کے مطالعہ سے تیسرا تاثر یہ قبول کرتا ہے کہ محبت کے سلسلے میں شاعر کے پیشِ نظر انسانی زندگی کا صرف وہی دَور ہے جو آغازِ شباب کا زمانہ ہوتا ہے اور جسے کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں (ADOLESCENCE) کا دَور کہنا چاہیے۔

اس دَور کی محبت میں ناپختگی، اضطرار، جذباتیت، چہل اور ہنسی اور مذاق کی فراوانی ہوتی ہے۔ گویا محبت میں "کھلنڈرا پن" موجود ہوتا ہے۔ راجہ صاحب نے محبت کے لاتعداد مختلف پہلوؤں میں سے "کھلنڈرا پن" کے پہلو کو اس لئے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے کہ ایک تو یہ پہلو خود شاعر کی مخصوص اُفتادِ طبع کے عین مطابق ہے۔ دوسرے جس قدر جذباتی اور ناپختہ کوئی کیفیت ہوگی، اتنا ہی مذاق کا نشانہ بھی بنے گی۔ چنانچہ راجہ صاحب آغازِ شباب کی محبت کو اس کی تمام تر ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے ساتھ پیش کر کے مزاح کی تخلیق کرتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر قاری کو مسرت بہم پہنچانے میں

کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عورت اور مرد کے ربطِ باہم کی ایک صورت تو اٹھتی جوانی کی وہ جذباتی محبت ہے جسے راجہ صاحب نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ربط کی دوسری صورت ازدواجی زندگی کا وہ خاص رنگ ہے جو ایک کامیاب جذباتی محبت کا ضروری نتیجہ ہے۔ اِس رنگ کو اُجاگر کرنے میں راجہ صاحب نے اُس "تضاد" کو موضوعِ سخن بنایا ہے جو جذباتی محبت کی ماورائی کیفیات اور ازدواجی زندگی کی خالص ارضی حیثیت میں ہے اور اس طرح خوابوں کی شکست و ریخت کے سارے منظر کو پیش کر دیا ہے۔ اِس عمل سے کوئی الم انگیز کیفیت معرضِ وجود میں نہیں آئی بلکہ انسانی فطرت کی ایک نمایاں غیر ہمواری سطح پر نمودار ہوئی ہے۔ اور اسی لئے یہ ناہمواری تفریحِ طبع کا موجب بنی ہے۔ پھر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ جب راجہ صاحب ازدواجی زندگی کی ننھی ننھی ناہمواریوں کو پیش کرتے ہیں تو قاری کے دل میں شادی کے بعد کی زندگی کے خلاف نفرت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں کرتے، بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ عورت اور مرد کے اس طویل ربطِ باہم کو اُجاگر کرتے وقت وہ ہمدردانہ اندازِ نظر کا مظاہرہ کرتے ہیں ـــ اس طور کہ ازدواجی زندگی کا زمانہ بجائے خود ایک دلچسپ کھیل کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ اس ازدواجی زندگی میں عورت اور مرد اپنے جذباتی اور ذہنی بگاڑ کے باعث ایک

دوسرے سے متصادم ہوتے، ایک دوسرے کو ہدفِ طنز بناتے اور ایک ہنگامی ناآسودگی کا مظاہرہ ضرور کرتے ہیں تاہم ایک تو اس سارے کھیل کی نوعیت نیم سنجیدہ نوک جھونک سے آگے نہیں بڑھتی۔ دوسرے اِس کے پس پشت شاعر کا ہمدردانہ اندازِ نظر اسے المیہ کا رُوپ اختیار کرنے سے باز رکھتا ہے نتیجتہً ازدواجی زندگی کی یہ تمام تصاویر، فرحت، انبساط اور آسودگی کے مواقع بہم پہنچاتی اور یوں اِس "ربطِ باہم" کو زندگی کے ایک نہایت خوشگوار دَور کی صورت میں پیش کر دیتی ہیں۔ یہ سب کچھ شاعر کی اُفتادِ طبع کے عین مطابق بھی ہے کہ اس کا مسلک زندگی کی مختلف کروٹوں سے تحصیلِ مسرت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اِس نکتے کے ثبوت میں یہ چند مثالیں قابلِ غور ہیں:۔

تو ہے اِک ڈاکو کا بیٹا تو نہیں رو میری جاں
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چنگیز دھاڑ خاں

ایک دن کا ذکر ہے روتی تھی میں سوتی نہ تھی
باپ تیرا چُپ کراتا تھا میں چُپ ہوتی نہ تھی
توڑ ڈالیں اُس نے اِک مکے سے میری پسلیاں
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چنگیز دھاڑ خاں

"جلال زادہ" ——————

کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول
اے مری رُوٹھی ہوئی بیوی ذرا مُنہ سے بول

شک نہ کر مجھ پہ مری جان سے پیاری ممتاز
پڑھ رہا تھا کسی مسجد میں تہجد کی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے تھے وہاں محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بندہ نواز
میرے ہی گھر سے نہ کر ہائے مرا بستر گول
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

پھول اِک روز ترے پیار کے توڑے مَیں نے
کھائے والد سے ترے عشق میں کوڑے مَیں نے
مر مریں ہات ترے پھر بھی نہ چھوڑے مَیں نے
بجز سسرال میں دوڑا دئے گھوڑے مَیں نے
اپنے ماضی کے ترازو میں ذرا مجھ کو تول
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

"دستکِ نیم شب" ——————

(۱)

زمیں کے چاند ترا حسن آسمانی ہے
ہر ایک جلوہ ترا اک نئی کہانی ہے

ہے تیرے جلوؤں سے رخشندہ میری عمر کی رات
زہے نصیب کہ تو ہو مری شریکِ حیات
گھر آؤں گا جو سرِ شام ہو کے میں بے حال
نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھول سے گال
گلے میں ہوں گے مرے ہار تیری باہوں کے
چمک اٹھیں گے ستارے تری نگاہوں کے
خدا کے واسطے کھولو بھی آ کے دروازہ
میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چیخ رہا
اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاجِ شریف
تو پنکھا جھلئے ذرا اُٹھ کے کیجئے تکلیف
یہ چارپائی مری ٹیڑھی کیوں بچھائی ہے
بھلا اِکنّی یہ کیوں فرش پہ گرائی ہے
چپاتیاں مرے اللہ سب کی سب کچّی
تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچّی ——

—————— "اس سے اور اُس سے"

بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجہ مہدی علی خاں کی نظموں میں شادی سے قبل اور شادی سے بعد کی زندگی کے ایسے تمام پہلو پیش ہوئے

ہیں جو ناہمواریوں کو جنم دے کر مسرّت و بہجت کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح اُنھوں نے اپنی نظموں میں محبت کے خالص ارضی پہلوؤں ہی کو زیادہ تر پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ محبت آدمؑ اور حوّا کی سیدھی سادھی اور بے لوث محبت ہی کا عکس نہیں بلکہ اس میں رُوح کی بجائے جسم زیادہ نمایاں اور اس کے نتیجے کے طور پر جسم کے صحت مند خون کا رنگ زیادہ روشن ہے اِن کے کردار محبت کے مادی پہلوؤں سے متاثر اور اس کے ارضی کیف سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے پہلے مجموعۂ کلام "مضراب" کی بیشتر نظموں میں محبت کا جذبہ، رنگین خطوط، چھیڑ چھاڑ اور محبوب کے جسم سے مس کی ہوئی اشیاء —— انگشتری، رومال وغیرہ تک محدود ہے اور اس مجموعے کے بعد کی نظموں میں چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک اور فلرٹیشن (FLIRTATION) کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں، اور اِن کے اس سارے طریقِ کار میں بچپن کے رجحانات منعکس ہیں۔ خود بچّہ اپنے قد کے مطابق ارد گرد کے ماحول کو دیکھتا ہے اور چونکہ وہ اپنے بڑوں کی بہ نسبت زمین سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس لئے زندگی اور ماحول کی طرف اس کے ردِّ عمل میں بھی زمین اور گوشت پوست سے وابستگی زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچّہ سب سے بڑا مادہ پرست ہے اور "بابر بہ عیش کوش" کا سب سے بڑا علم بردار۔ بچے کے اس صحت مند رجحان کو اگر بعد کی زندگی میں قائم رکھا جائے تو

جوانی کی محبت کے بارے میں وہی ردِّ عمل اُبھرتا ہے، جسے راجہ مہدی علی خاں نے پیشِ نظر رکھا ہے اور جس کے نتیجے کے طور پر محبت کا جسمانی اور مادی پہلو اُبھر کر نمایاں ہو جاتا ہے۔

راجہ مہدی علی خاں کے ہاں تحصیلِ مسرت کا یہ رجحان "آدم اور حوا" کی کہانی کے مکرر بیان تک ہی محدود نہیں۔ اِس کہانی کے مختلف کرداروں کی مسرتوں اور خوابوں میں شرکت کرنے اور ان کی ناہمواریوں کو مذاق کا نشانہ بنانے کی یہ روش وسیع تر زندگی کی ناہمواریوں تک بھی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس طرح وہ نوخیز جذباتی محبت کی ناہمواریوں کو گرفت میں لیتے ہیں اور ازدواجی زندگی کی سنجیدہ فضا میں مضحک پہلو تلاش کر لیتے ہیں بالکل اسی طرح وسیع تر زندگی کی بے رنگی، یکسانیت اور سنجیدگی میں بھی انہیں انسانی افعال کے مضحک پہلو فی الفور نظر آ جاتے ہیں۔ زندگی کا ایک عام ناظر عادت اور تکرار کے حصار میں اس بری طرح قید ہوتا ہے کہ اُسے اشیاء کے نوکیلے کنارے نظر ہی نہیں آتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ زندگی کی پامال راہوں میں ایک مشین کی سی سنجیدگی کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے اور اُسے کبھی ایک لحظہ کے لئے رُک کر اپنے اور اپنے ساتھیوں کے جذباتی انہماک پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ایسا شخص نہ تو کبھی ایک اچھا فن کار بن سکتا ہے اور نہ اُسے انسان کے جذباتی تقاضوں

پر ہنسنے کا منصب ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ راجہ مہدی علی خاں کی نظموں کی اہمیت اس بات میں ہے۔ کہ شاعر نے عام زندگی کے مضحک پہلوؤں کو تلاش کیا ہے اور پھر ان ناہمواریوں کو سطح پہ لانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ایک عام ناظر کو لحظہ بھر کے لئے رُک کر اپنے جذباتی انہماک پہ ہنسنے کا موقعہ بھی ملتا ہے۔ گویا شاعر نے ناظر کو زندگی کی بے رنگی اور یکسانیت کا احساس دلانے کے لئے اس سب سے بڑے انسانی المیہ پہ "نوحہ" نہیں لکھا بلکہ محض اس کی مضحکہ خیز صورت پر سے پردہ اٹھایا ہے اور ناظر کو یکلخت انسانی افعال کی ناہمواریوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ یہ چند ٹکڑے دیکھئے:۔

آئی جو ایک اور بھی آتی چلی گئیں
چھوٹے سے ایک گھر میں سماتی چلی گئیں
بچوں کی فوج لے کے ہوئیں گھر پہ حملہ زن
ہم "دشمنوں" کے ہوش اُڑاتی چلی گئیں
غنچہ دہن اُگلتے رہے دودھ بار بار
یہ بار بار دودھ پلاتی چلی گئیں
ننھوں نے فرشِ پاک پہ دریا بہا دئیے
دریاؤں میں یہ بند لگاتی چلی گئیں
بچوں نے چھیڑے ناک سے نغمے شرڑ شرڑ
ناکیں پکڑ کے "چھوں" یہ کراتی چلی گئیں "بیوی کی سہیلیاں"

رضیہ ذرا گرم چاول تو لانا   ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا
بہت خوبصورت، بہت نیک تھا وہ   ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

منگانا پلاؤ ذرا اور خالہ   بڑھانا ذرا قورمے کا پیالہ
جدھر دیکھتے ہیں اُدھر غم ہی غم ہے   کریں اس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے

یہ نعمتّی کے زردے ہیں کشمش ہے تھوڑی   بہت دیر سے مانگتی ہے نگوڑی
وہ ٹکڑا جگر کا تھا آنکھوں کا تارا   ہمیں اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا

پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈالڈے کا   خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دُلہن سے کہو آہ اتنی نہ روئے   بے چاری نہ بے کار میں جان کھوئے

اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے   یہ چھچھڑا لکھا تھا مقدر میں میرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ   ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

——— "ایک جہلم"

کُتا کیوں اپنی دُم دباتا ہے؟   کتنے میں ایک بندر آتا ہے؟
تھوڑی پور میں کتنے مالی ہیں؟   شہر میں کتنے مکان خالی ہیں؟

آج کیا بھاؤ ہے بتاشے کا؟   کیٹس کا وزن کتنے ماشے تھا؟
لانگ فیلو کی کتنی ٹانگیں تھیں؟   صبح مُرغے نے کتنی بانگیں دی ہیں؟
اُردو ناول میں کیا جھکاؤ ہے؟   کیوں نئی شاعری میں تاؤ ہے؟

——— "بورڈ آف انٹرویو"

لہنا سنگھا کلمہ پڑھ!
لا الٰہ ——— آگے بڑھ!
آگے آپ بتا دیجیے،
میری جان بچا لیجیے،
آگے مجھے اگر آتا
تم سے میں کیوں پڑھواتا
سوچ نہ اب بیکار رحیم!
مار اس کو تلوار رحیم!
دور ہوں اس کے سب جھگڑے
کر دے اس کے دو ٹکڑے

——— "پارٹیشن"

اِن نظموں کے مطالعہ سے محض یہی تاثر مرتب نہیں ہوتا کہ راجہ مہدی علی خاں زندگی کے رُخِ روشن کے خوشگوار لیکن مضحک پہلوؤں

کو پیش کرکے مسرت و بہجت کی ایک فضا قائم کرلیتے ہیں، بلکہ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی المناک حقیقتوں کے مضحک پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہیں۔ "ایک جہلم" کے سلسلے میں اُنھوں نے دُولہا کی المناک موت کے پس منظر پر انسان کی ریاکاری، تصنع اور دنیاداری کے نقوش کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ ناظر اس "ٹریجڈی" سے متاثر ہونے کی بجائے "طنزِ بیباکِ اہلِ دنیا" کو دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے۔ اسی طرح "پارٹیشن" میں انھوں نے مذہبی جنون کے مضحک پہلو کو اس طور پیش کیا ہے کہ قتل، کا کرب انگیز پہلو دب کر رہ گیا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ملک کی پارٹیشن کو جسم کی پارٹیشن (کر دے اس کے دو ٹکڑے) سے تشبیہ دے کر فن کا ایک لطیف نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ فطرت کی طرف سے بعض لوگ مسرت کی تقسیم پر مامور ہوتے ہیں اور وہ زندگی بھر روتی بسورتی ہوئی خلقت کے آنسو پونچھنے اور اسے ہنسانے کے مبارک کام میں مصروف رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات وہ غم سے بھی اہلِ دنیا کے لئے تفریح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں کا شمار انہی لوگوں میں ہونا چاہیئے۔

راجہ مہدی علی خاں "حال" کے شاعر ہیں۔ اور اسی لئے ان کی نظموں میں گوشت پوست کی زندگی سے ایک گہری وابستگی کے شواہد ملتے ہیں۔ ان کے ہاں اس زندگی اور اس کے ارضی پہلوؤں سے لطف اندوز ہونے کا رجحان اس قدر توانا ہے کہ انھوں نے محبت، ازدواجی رفاقت اور وسیع تر زندگی

کی ناہمواریوں ہی سے حظ اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر اُس خیال کا مذاق بھی اُڑایا ہے جو گوشت پوست کی اِس زندگی اور اس کی بے بہا مسرتوں سے انسان کی نظریں ہٹا کر کسی خیالی جنت کی طرف مبذول کراتا ہے۔ چنانچہ اِن کی نظموں کا ایک بہت بڑا حصہ جنت اور اُس کی فضا سے متعلق ہے۔ وہ جب جنت کی ارفع اور پاکیزہ فضا میں مسرت کی خالص ارضی کیفیت کو پیش کرتے ہیں تو سارا ماحول مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے۔ راجہ صاحب نے اِس ناہمواری سے بدرجۂ اتم فائدہ اُٹھایا ہے اور جنت کے ابدی روحانی کیف کو خالص ارضی مسرت کی سطح پر لا کر ایک دلچسپ مزاحیہ تقابل کو جنم دیا ہے۔ اِن نظموں کے مطالعہ سے شاعر کا اندازِ نظر بھی واضح ہوتا ہے۔ وُہ مستقبل کی ابدی مسرت کو نشانۂ طنز بنا کر گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسرت کی نوعیت عارضی اور ہنگامی ہے اور اسی لئے اس کا بہت گہرا تعلق زمین سے ہے نہ کہ آسمان سے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مستقبل کے ابدی کیف پر حال کی عارضی مسرت کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی ان کا مطمحِ نظر ہے۔ جنت کے بارے میں لکھی گئی ان نظموں سے راجہ صاحب کا وہ ردِّ عمل بھی واضح ہوتا ہے، جو محبت، ازدواجی رفاقت اور وسیع تر زندگی کی ناہمواریوں کے پیش نظر پیدا ہوا تھا۔ یہ ردِّ عمل ایک خوش باش، صحت مند اور کھلنڈرے لڑکے کا ردِّ عمل ہے —— اور یہ لڑکا زندگی کی مسرتوں میں شریک ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ چنانچہ راجہ مہدی علی خاں کی جنت

دراصل اسکول سے باہر کی وہ دُنیا ہے جس تک وہ اور اس کا ہم زاد —
شیطان پہنچنا چاہتے ہیں ۔ پس جب وہ جنّت کی دیوار پر چڑھ کر جنّت کے
اندر کی دُنیا پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو دراصل اسکول کی دیوار پر سے باہر
کی دُنیا کو دیکھ رہے ہوتے ہیں ۔ فی الواقعہ جنّت کے مظاہر کی طرف ان کا
سارا ردِّ عمل ایک شریر لڑکے کا ردِّ عمل ہے اور اسی لئے انہیں جنّت کے
بظاہر سنجیدہ واقعات اور کرداروں کے بعض سنجیدہ اعمال میں مضحک پہلو
فی الفور نظر آجاتے ہیں ، یہ ایک مثال قابلِ غور ہے : ۔

جنّت کی دیوار پہ چڑھ کر   میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
جو نہ کبھی ہم نے دیکھا تھا   ہو کر حیراں دیکھ رہے تھے

وادیٔ جنّت کے باغوں میں   اُف توبہ اِک حشر بپا تھا
شیطاں کے ہونٹوں پہ ہنسی تھی   میرا کلیجہ کانپ رہا تھا

میں نہ کبھی بھولوں گا توبہ   میں نے دیکھا جو نظّارہ
"لعنت لعنت!" بول رہا تھا   جنّت کا ہر منظر پیارا

موٹی موٹی توندوں والے   بدصورت بدہیئت مُلّا

خوف زدہ حوروں کے پیچھے   بھاگ رہے تھے کہہ کے "ہاہا"
"مَیں اور شیطان دیکھ رہے تھے"

اس کے مقابلے میں جہنّم یعنی اسکول کے اندر کا نقشہ دیکھئے جہاں
سے ایک "شریر لڑکے" کے باہر نکال دیئے جانے کا سارا منظر آنکھوں کے
سامنے آجاتا ہے ۔

فرشتوں نے جب مجھ کو دوزخ میں پھینکا   ڈسا مجھ کو اِک سانپ نے پہلے آکر
پھر اک کالے بچھو نے "چٹکی میری لی   پھر اِک بھڑ نے کاٹا مجھے مُسکرا کر
جہنّم کے بھٹکے ہوئے باسیوں نے   مجھے دیکھ کر قہقہے خوب مارے
چڑیلوں کے دادا یہ بھتنوں کے نانا   لگے کہنے "رنگین طبیعت ہے پیارے"
بھویں تن گئیں میری غصّے کے مارے   کیا میری فطرت نے مجھ کو اِشارا
جہنّم کے ایک ایک باسی کو میں نے   وہیں پر پچھاڑا وہیں خوب مارا
اُٹھائی وہاں میں نے ایسی قیامت   جہنّم کے باسی جہنّم سے بھاگے
میں لوہے کی لٹھ لے کے تھا پیچھے پیچھے   وہ اُکھڑے قدم لے کے تھے آگے آگے
گئیں ٹوٹ اُن نامرادوں کی کمریں   بہت اُن کی آنکھوں نے آنسو بہائے
ہر اک کہہ رہا تھا "بچاؤ بچاؤ!   ارے مر گئے مر گئے ہائے ہائے!
جہنّم کے لوگوں کی دیکھی یہ حالت   تو شانِ کریمی کو رحم اُن پہ آیا
"نکالو نکالو" اسے جلد باہر!   یہ کہہ کر جہنّم سے مجھ کو بھگایا

چلو یار منٹو چلو کرشن چندر! یہ کہہ کر وہاں سے ہُوا میں روانہ
ہمیں دُور سے کر رہا تھا اشارے سرِ شام جنّت کا موسم سہانا

"جہنم میں غنڈے"

راجہ مہدی علی خاں نے جنّت کا مذاق اُڑا کر ہمیں اپنے تصوّرات، عقائد اور نظریات پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کی تحریک بھی دی ہے۔ بالعموم عقیدہ، تنقید اور تجزیے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نظریات اور تصوّرات کے سلسلے میں بھی آنکھیں بند کر کے ایک سیدھی پامال لکیر پر بڑھتے چلے جانے کا رجحان عام ہے۔ راجہ صاحب نے اپنی نظموں میں عقائد اور نظریات کے مضحک پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ "دعا" "شیطان" "اشنان" "مریدانِ باصفا" وغیرہ نظموں میں ان کا یہ طریقِ کار بہت نمایاں ہے۔ اس سے جذباتی تشنج کی کیفیت مدھم اور مریضانہ سنجیدگی کا دباؤ کم ہُوا ہے اور اس تشنج اور دباؤ کے ہٹ جانے سے قاری کو ایک عجیب طرح کی فرحت نصیب ہوئی ہے۔ ماحول، زندگی اور عقیدے کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا یہ رجحان آخر آخر میں ایک انوکھے رُوپ میں نمودار ہُوا ہے۔ اس سلسلے میں یہ دو نظمیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں:۔

ویران تھا صحرا خاموش تھا دریا
دریا کے کنارے سردی سے ٹھٹھرتا

اِک اودھ کے ڈپٹی چُپ چاپ تھا بیٹھا
کرسی کی لئے ٹیک
کالا سا پہاڑ ایک

——— "کلاہ پوش"

اِس پہ بہت ہنستا ہُوں میں
میرے خدا سُن تو ذرا
یہ آسمان کا بُلبلہ
کیوں تُو نے ہم پر رکھ دیا!

——— "آسمان کا بُلبلہ"

یہ نظمیں اس بات پر دال ہیں کہ راجہ صاحب اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ کے تحت جب زندگی کے بے جان مظاہر اور کائنات کی پُر اسرار وسعت پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو انہیں ساری دُنیا ہی بے ڈھب اور مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہے اور وہ اُس کے "بے ڈھنگے پن" کا تصوّر کر کے بے اختیار مسکرانے لگتے ہیں۔ اس سے قاری کا جذباتی انہماک کم ہوتا ہے اور وہ بھی شاعر کے زاویۂ نگاہ کو اپنا کر بے جان مظاہر کی مضحکہ خیز صورتوں سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ مسرّت بہم پہنچانے کا یہ انوکھا انداز راجہ مہدی علی خاں سے خاص ہے اور اس خاص میدان میں ان کی حیثیت یقیناً منفرد اور یکتا ہے۔ وزیر آغا

میری نظموں کا دوست

(۱)

مَیں نے اپنے حافظے پر بہت زور دیا ہے۔ بہت دُور دُور تک نظریں دوڑادی ہیں۔ تعجب ہے کہ اس وسیع و عریض دُنیا میں مجھے اپنا کوئی دوست، کوئی ہم خیال، کوئی خیر خواہ نظر نہیں آیا۔ کوئی کتا، بلّی تک مجھ سے ملتفت نہیں۔ پناہ بخدا!

لیکن میری نظموں کا کم از کم ایک دوست اس دُنیا میں ضرور ہے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے اپنی نظموں سے جلن سی ہوگئی ہے۔ یہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ اور میری دوسری آنکھ شاید ہے ہی نہیں۔ البتہ اپنی تیسری آنکھ سے مَیں نے اس دُنیا پر چند اچٹتی ہوئی نگاہیں ضرور ڈالی ہیں اور بقدرِ ظرف جو کچھ دیکھ سکا یا محسوس کر سکا، اُسے اکثر قافیے اور ردیف کے ساتھ اور کبھی کبھی اس کے بغیر بھی لکھ دیا ہے۔

میں اپنی "نظموں کے دوست" سے کبھی نہیں ملا۔ وہ یہاں سے بُہت دُور سرحد پار رہتا ہے۔ اپنی نظموں کے علاوہ میں اُس سے بھی جلتا ہوں، شاید اس لئے کہ وہ بھی ایک شاعر ہے۔ صرف شاعر ہوتا کوئی اتنی بری بات نہ تھی، لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ مجھ سے بہتر شاعر ہے۔ بات برداشت کرنے کی نہیں ہے۔ تاہم بادلِ ناخواستہ میں شاید اسے بھی رو دھو کر برداشت کر لیتا، لیکن جب اُس کے خطوں سے یہ حقیقت کسی عدالتِ عالیہ کے منصفانہ فیصلے کی طرح مجھ پر ثابت ہوگئی کہ وہ مجھ سے بہتر انسان بھی ہے تو معاملہ حدِّ ضبط سے باہر ہوگیا ـــــ اپنی "نظموں کے دوست" کا یہ قصور میں کبھی معاف نہیں کر سکتا ـــــ اُس کے کیریکٹر کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اتنی سی بات لکھ دینا کافی ہوگی۔ کہ وہ کسی بُری چیز کو "بُرا" کہنے کی بجائے "اچھا" کہتا ہے۔ ظالم!

کہتے ہوئے جی جلتا ہے لیکن حقیقت ہے کہ "میری نظموں کا دوست" ایک عظیم الشان نقاد ہے۔ ایک اعلیٰ پائے کا ادیب ہے اور شاعر ایسا کہ دیکھ کر رشک ہو، پڑھ کر جی جلے۔ شاعری کے ساتھ مصوّری بھی کر جاتا ہے تاکہ آرٹ کی اس صنف میں بھی کسی دوسرے کے لئے جگہ نہ رہے۔ مصوّر تو سات جانے پہچانے رنگوں کی آمیزش سے تصویریں بناتے ہیں۔ یہاں گنت رنگوں کی آمیزش سے اپنی نظموں کے پسِ منظر میں اور کبھی کبھی

لفظ لفظ کے پیچھے ایسی رنگا رنگ تصویریں بنا دیتا ہے کہ پڑھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں کہ وہ ان تصویروں کو دیکھیں یا ان نظموں کو پڑھیں، اس طرح اپنے شیدائیوں کے لئے وہ باعثِ "مصیبت" بنا ہوا ہے۔ اور اب تو اس ظالم نے افسانے بھی لکھنے شروع کر دیئے ہیں اور افسانے بھی ایسے کہ مجھ جیسا آدمی پوچھنے پر مجبور ہو جائے کہ ؎

"وہ فتنے" آدمی کی "خانہ ویرانی کو کیا کم تھے ؟

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، اپنی نظموں کے دوست سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ البتہ اُن خطوں میں وہ اکثر مجھے دکھائی دیا ہے جو میرے خطوں کے جواب میں مجھے اکثر اُس کی طرف سے موصول ہوتے رہے ہیں۔ انہی خطوں میں میں نے اُسے پڑھا بھی ہے ممکن ہے وہ آپ کو ایسا دکھائی نہ دے جیسا کہ میں نے اُسے دیکھا ہے یا پایا ہے۔ لیکن آپ تو اُسے دونوں آنکھوں سے دیکھتے رہے ہوں گے۔ تیسری آنکھ سے آپ نے نہیں دیکھا ہوگا۔

اُس کی شاعری کی دنیا میں میری اکثر اُس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اپنی دُنیائے تصوّر میں بھی میں نے بارہا اُسے دیکھا ہے ــــ چاندنی راتوں میں پُر اسرار دشت پیمائی کرتے۔ گرجتے بادلوں کے نیچے بڑبڑاتے۔ جنگل میں بوڑھے درختوں سے دوستی کرتے۔ کھنڈروں میں آدھی رات کو ہواؤں

میں اپنے خیالات کے دیئے جلاتے، اُداس وادیوں میں تنہائیوں سے لپٹتے جھگڑتے، سر بہ خم آبشاروں کو اور بھی زیادہ خاکساری کی خاموش تلقین کرتے قوسِ قزح کے پُل پر چڑھتے اور اُترتے۔ برف کی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے "جلیشی پہاڑوں" سے تبادلۂ خیالات کرتے، چمنستان میں خوبصورت تتلیوں کو ڈکتے۔

وہ ہماری دُنیا سے بہت دُور اپنی دُنیا میں رہتا ہے۔ اسے جنگلوں اور ویرانوں سے بہت محبت ہے۔ وہ جنگل میں کسی ندی کے کنارے یا کسی چشمے پر یا کسی باریش بوڑھے برگد کے تلے بیٹھ کر دنیا و مافیہا کو بھول جاتا ہے۔ جنگل کے پرندے اُسے بے آزار سمجھ کر اس کے سامنے کسی پیڑ پر آ بیٹھتے ہیں۔ اُسے حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اس پر "رحم" کھاتے ہیں اُسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، جب وہ کسی طرح اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو وہ مارے غصے کے بطور گالی اُسے "خاموش کہیں کا"! کہہ کر مسرت کی تلاش میں کہیں دُور اُڑ جاتے ہیں۔ سفید خرگوش دبے پاؤں اُس کے قریب آتے ہیں۔ شاعری کے بارے میں اُس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں قریب آکر "فوں فوں" کی آوازیں نکالتے ہیں۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہے تو وہ اُس کا مُنہ چڑا کر "سرپٹ" بھاگ جاتے ہیں۔ جنگل کے ہرن، اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے پتوں اور ڈالیوں کی اوٹ لے کر اُس کے

قریب آجاتے ہیں اور اشارے ہی اشارے میں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں "دیکھو! وہ بیٹھا ہے! وہ!!"

اپنی "خطوں کے دوست" سے میری خط و کتابت ہمیشہ "کام کی باتوں" تک محدود رہی ہے۔ جب بھی میں نے اُسے ان حدود سے باہر لانا چاہا مجھے ناکامی ہوئی۔ خطوں میں ہزاروں کروڑوں باتوں کا جواب نہایت صفائی سے گول کر جانا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اُس کے بارے میں اگر کوئی بات معلوم کرنی ہے تو اُس سے نہیں پوچھتے۔ اس کے لئے انہیں اُس کے پڑوسیوں سے خط و کتابت کرنی پڑتی ہے۔

اِس ایک سال کے عرصے میں اُس کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ صبح ناشتہ کرتا ہے، دوپہر کو کھانا کھاتا ہے، چار بجے چائے پیتا ہے اور رات کو کھانا کھا کر سو جاتا ہے۔ مہینے میں ایک بار "ایڈیٹر" "ادبی دنیا" سے ملنے اپنا شہر چھوڑ کر لاہور جاتا ہے۔ اُن سے کوئی بات کرتا ہے یا بغیر بات کئے واپس آجاتا ہے۔ یہ بات ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ اُسی شام کی گاڑی سے واپس آجاتا ہے۔ ٹرین میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ اپنے ساتھ ایک ملازم رکھتا ہے۔ اگر کوئی اُسے سلام کرے تو نوکر اس کی طرف سے سلام کا جواب دے دیتا ہے۔ اگر کوئی اس بات پر حیرت زدہ ہو تو نوکر اُسے بتا دیتا ہے کہ "صاحب ذرا بات چیت کم کرتے ہیں۔ مجھے انہوں نے

اسی کام کے لئے نوکر رکھا ہے۔"

لاہور سے بہت دُور وہ اپنے شہر کے نواح میں "شور و شر سے چھپ کر رہتا ہے۔ لیکن اینٹ پتھر کے مکان میں نہیں بلکہ متانت اور سنجیدگی کی اُونچی اُونچی دیواریں اُس نے اپنے اِرد گرد کھڑی کر رکھی ہیں۔ اِن پر ازلی اور ابدی خاموشی کی چھت ہے۔ آنگن میں بے خودی کے پھول کھلے ہیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ نہ دکھائی دینے والی تصویریں آویزاں ہیں۔ ڈرائنگ روم میں فلسفہ اُس کا فرنیچر بن گیا ہے۔ گھر میں اس کے چاروں طرف جگہ جگہ "طاق ہائے نسیاں" ہیں۔ جہاں ہر وقت عجیب و غریب روشنیوں کے چراغ جلتے رہتے ہیں۔

آپ کچھ بھی کہیں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سال میں صرف ایک آدھ مرتبہ وہ بات کرتا ہے۔ جب خزاں آ کر اُس سے پوچھتی ہے "میں جاؤں؟" تو وہ اثبات میں سر ہلا دیتا ہے۔ پھر بہار اپنی کسی ادائیں کمیلی بڑے ادب سے اُس کے پاس آ کر سلام کرتی ہے اور کہتی ہے "میں آؤں؟" تو وہ جواب میں مسکرا کر "ہاں" کا اشارہ کر دیتا ہے۔ عموماً سال میں اس کی یہ پہلی یا دوسری مسکراہٹ ہوتی ہے، اس کے بعد کوہ و بیاباں، دشت و جبل اور چمن پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔ کم از کم میں نے اسے یوں ہی دیکھا ہے۔ جس شخص سے آپ ملتے رہے ہیں۔ وہ اِسی نام کا کوئی اور ہو گا۔

ایک مرتبہ اپنی "نظموں کے دوست" سے ملاقات کا شوق حد سے بڑھ گیا، تو چونکہ میری صحت پاکستان کا لمبا سفر کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، مَیں نے خطوں میں "وقتاً فوقتاً" اُس کا مزید تعارف کرنا چاہا۔ آخری خط میں مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ "نظم نگاری اور "ادب نویسی" کے علاوہ آپ کا شریفانہ شغل کون سا ہے؟ اللہ کی قسم خط کی اُن تمام باتوں کا جواب تو تھا جو میری نظموں کے بارے میں تھیں، لیکن اس سوال کا جواب بالکل غائب تھا۔ میں بھی یہ سمجھ کر خاموش ہوگیا کہ "میری نظموں کا دوست" شاید کوکین کی خفیہ تجارت کرتا ہوگا یا بردہ فروش ہوگا۔ کسی کے خفیہ راز پوچھ کر اُسے شرمندہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ہے "میری نظموں کے دوست" کی مختصر ترین کہانی۔

(۲)

آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے متعلق یا اپنی نظموں کے متعلق کچھ کم لکھ رہا ہوں اور اپنی "نظموں کے دوست" کے متعلق زیادہ۔ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اس وقت آپ میری جو نظمیں پڑھنے والے ہیں یا پڑھ رہے ہیں۔ ان کا مصنف بھی "میری نظموں کا دوست" ہی ہے۔

مَیں نے اپنے ایک خط میں محض تفریحاً بڑی غیر سنجیدگی سے اپنی چند

نظمیں مولانا صلاح الدین احمد صاحب کو بھیجی تھیں اور لکھا تھا "پڑھ کر چاک کر دیجیے"۔ لیکن میری یہ نظمیں شاید مولانا صلاح الدین نے "میری نظموں کے دوست" کو بھیج دیں اور اس کے بعد یہ سب گڑبڑ شروع ہوگئی۔

مَیں نے اپنے اس خط میں "اپنی نظموں کے دوست" کا بھی ذکر کیا تھا اور اُن سے پوچھا تھا کہ "وہ کون ہے؟ اس کا نام بڑا دلچسپ ہے۔ کیا وہ کوئی ایرانی ہے؟ مجھے اس کا نام ہانٹ کر رہا ہے۔ میں اِس شخص سے خط وکتابت کرنا چاہتا ہوں"۔ اس زمانے میں مَیں اپنی نظموں کے دوست سے ناواقف تھا۔ اور اس کی ایک بھی نظم ادب کی دنیا سے لاکھوں میل دُور ہونے کی وجہ سے اب تک میری نظروں سے نہیں گذری تھی۔

ایک دن یکایک میرے نام "میری نظموں کے دوست" کا خط آگیا۔ جس میں اُس نے میری نظموں کی مبالغہ آمیز انداز میں بہت تعریف کی تھی۔ اگر مجھے اپنی نظموں کے دوست کی طرف سے یہ مبالغہ آمیز داد نہ ملتی اور مجھ پر اور لکھنے کے لیئے زور نہ دیا جاتا تو مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ مجھے بھی لکھنا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ نظمیں میں نے نہیں لکھیں "بزورِ شمشیر" مجھ سے لکھوائی گئی ہیں۔ اسی لئے میں اپنے موجودہ دَور کی تمام نظموں کو اِسی شاعر کی تخلیق سمجھتا ہُوں۔ البتہ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکی اور صدیوں تک نہیں آئے گی کہ متانت اور سنجیدگی کے اس پہاڑ کو میری غیر سنجیدہ اور غیر شریفانہ نظمیں کیوں پسند ہیں۔

میری نظموں کو مجموعے کی صورت دینے کا ذمّہ بھی "میری نظموں کا دوست" ہی ہے۔

مَیں نے بہت سمجھایا تھا کہ ان نظموں کو مجموعے کی صورت دے کر پبلک کی دِل آزاری نہ کی جائے۔ لیکن وہاں کون سنتا تھا، خطوں میں جسے چھوٹا بھائی بنایا تھا، وہ اپنی سنجیدگی اور متانت کا رُعب ڈال کر "بڑا بھائی" بن چکا تھا۔ لاکھ سمجھایا کہ دیکھو رُعب ڈال کر "بڑا بھائی" بننے کی کوشش مت کرو۔ لیکن اس "پٹھان" کے سامنے اس راجپوت کو ہار ماننی پڑی۔ راجپوتوں میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ طاقت ور اور بہادر ہونے کے باوجود آخر میں بیچارے ہار جاتے ہیں۔ اب میری یہ حالت ہے کہ میں اِس عالمِ ہوش و حواس میں صرف دو ہی "ہستیوں" سے خائف ہوں، آسمان کے خدا سے اور زمین کے اس "پٹھان" سے ——

اگر اِن نظموں کو پڑھ کر خدا نخواستہ آپ مجھے داد دینا چاہیں تو اس داد کا مستحق بھی "میری نظموں کا دوست" ہے۔ اگر آپ مجھ پہ بیداد کرنا چاہیں تو اس کی مستحق بھی یہی پُراسرار ہستی ہے۔ اگر آپ بیکار ہیں، آپ کو اور کوئی کام نہیں تو ذرا اُسی شہر کا رُخ کیجیے جہاں "میری نظموں کا دوست" چھُپ کر رہتا ہے۔ آپ اُسی کے مکان کے سامنے احتجاجی مظاہرے کیجیے، اس کے خلاف مشاعرے برپا کیجیے، بغیر قافیوں کے نظمیں یا غزلیں لکھیے، قانونی یا غیر قانونی چارہ جوئی کیجیے جیسا بھی آپ کا موڈ ہو۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اگر کسی صاحب کو مجموعہ اس قیمت میں مہنگا معلوم ہو جو انھوں نے اس

کے خریدنے پر صرف کی ہے تو دام واپس کرنے کی ذمّہ داری البتہ میں اپنے سر لیتا ہوں، یہ رقم آپ کبھی بھی بمبئی میرے غریب خانے پر تشریف لا کر واپس طلب کر سکتے ہیں، لیکن یہ شرط صرف پاکستانی کرم فرماؤں کے لئے ہے۔ ہندوستان والے مجھ پر بگڑنے کی بجائے، پاکستان جا کر میری نظموں کے دوست پر فوجداری کریں۔

اگر آپ اس کتاب کی قیمت واپس لینے کے لئے کسی وجہ سے بمبئی تشریف نہ لا سکیں تو صبر کیجیے۔ اس کا اجر آپ کو آخرت میں ملے گا۔ لیکن اگر خدا نے آپ کو صبر کی دولت سے مالا مال نہیں کیا۔ اور آپ مغلّظات پر اُتر آنا چاہتے ہیں اور یہ مغلّظات آپ مجھ تک پہنچائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو جس طرح شرفاء ہر قسم کی خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ بھی درج کر دیا کرتے ہیں۔ مَیں نے بھی ایک شریف آدمی کی طرح ترسیلِ مغلّظات کے لئے اپنا پورا پتہ نیچے درج کر دیا ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلّق ہے، میری نظموں کا اس دُنیا میں صرف ایک دوست ہے۔ میری نظموں کو ایسا دوست کبھی نہیں ملے گا، حقیقت ہے کہ یہ نظمیں مَیں نے اُسی کے لئے لکھی ہیں۔ جب اُس سے میرے تعلّقات ختم ہو جائیں گے تو نظموں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ میری نظموں کی زندگی اور موت اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

جی چاہتا ہے کہ پاکستان جاکر اپنی نظموں کے اس دوست سے کبھی ملوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جونہی میں اُس کے مکان پر جاکر دستک دوں گا یا اندر اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجوں گا وہ اپنے مکان کی پچھلی دیوار میں جلدی سے نقب لگا کر کہیں جنگلوں میں بھاگ جائے گا۔

اچّھا ہے کہ یہیں بیٹھ کر ہر روز اُس کے خط کا انتظار کیا کروں، جو میری تاریک اور خاموش زندگی میں کبھی کبھی باغِ جنّت کے چاند کی طرح طلوع ہو کر مجھے ابدی مسرّتوں کے طوفان میں بہالے جاتا ہے۔

۲۵ جنوری ۱۹۶۱ء — راجہ مہدی علی خاں

۱۴۹ - پالی روڈ - باندرہ - بمبئی ۵۰ - بھارت

طفلِ تسلّیاں

چور کی دُعا

اے خالقِ ہر ارض و سما وقتِ دُعا ہے
بندے پہ ترے آج عجب وقت پڑا ہے
پہلے بھی ہر آفت سے مجھے تُو نے بچایا
دائم رہا مجھ پر تیرے الطاف کا سایا
جب نام ترا لے کے کوئی نقب لگائی
ہر کام کی تدبیر مجھے تُو نے سجھائی
سچ تو یہ ہے کُتّوں کو سُلا رکھتا ہے تُو ہی
میرے لئے دروازہ کھُلا رکھتا ہے تُو ہی
انصاف کے پنجے سے مجھے تُو نے چھڑایا
اور دامِ حوالات میں اوروں کو پھنسایا

دل میں بہت ارمان لئے نکلا ہوں گھر سے
ایسا نہ ہو ناکام میں لوٹوں تیرے در سے
نامی کوئی ڈاکو نہیں چھوٹا سا ہوں اک چور
رحم آتا ہے بندوں پہ۔ بہت دل کا ہوں کمزور
مجھ سے کبھی گاڈریج کے تالے نہیں ٹوٹے
تیری ہی قسم میں نے کبھی بنک نہ لوٹے
چھ سات سو مل جائے تو بندے کو ہے کافی
وہ چور نہیں ہوں جو کرے وعدہ خلافی
اِس چھت پہ کمند اپنی میں پھینکوں گا گھما کر
ہمّت دے مجھے اتنی کہ چڑھ جاؤں میں فرفر
بسم اللہ! ارے واہ میں قربان، میں قربان
کیا خوب لگی ہے کمند! اللہ تیری شان

خرگوشوں کی غزل

کوئی شکاری بار بار بن میں ہمارے آئے کیوں؛
چونکیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ڈرائے کیوں؛

گھر نہیں، جھونپڑی نہیں، کٹیا نہیں، مکاں نہیں؛
بیٹھے ہیں جنگلوں میں ہم کوئی ہمیں بھگائے کیوں؛

کان کھڑے نہ کیوں کریں، گھاس میں کیوں نہ ہم چھپیں
کھٹکا ذرا بھی ہو اگر، کوئی ٹھٹھک نہ جائے کیوں؛

بن میں ہمارے جو بھی آئے، سیر مزے سے وہ کرے
آئے ہزار بار خود، کتوں کو ساتھ لائے کیوں؛

امّی سے مار کھا کے بھی، خوش کوئی کس طرح رہے
پانی مزے سے کیوں پیئے گھاس مزے سے کھائے کیوں؛

کتا تھا اک شکاری پہ "آئیں گے ہم ضرور یاں
جس کو ہو اپنی جاں عزیز بن میں وہ گھر بنائے کیوں"؛

چڑیاں نہ چہچہائیں کل، سوئیں گے ہم دوپہر تک
بند ہے بن کا مدرسہ کوئی ہمیں جگائے کیوں؛

چار بجے

بیٹھے بٹھائے ہو گئی گھر میں مار کٹائی، چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے

"اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ "دعا" نے کام کیا"
امّی اور ابّا نے مل کر میرا "کام تمام" کیا"

آج محلّے بھر میں گونجی میری دُہائی، چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
کتنی خوشی سے ہم نے اپنے پِٹنے کی تیاری کی

سارے گھر میں ہم نے کیسی دُھوم مچائی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے

بی ہمسائی تو کیوں آئی تجھ کو شاید علم نہیں
یہ میرے پِٹنے کا منظر ہے، کوئی اچھی فلم نہیں

تو مرا یہ "بیٹنی شو" کیوں دیکھنے آئی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے

چائے کی میز پہ میں نے کچھ کچھ نقص نکالے فُوڈ میں تھے
ہائے ری قسمت امّی ابّا دونوں ہی کچھ مُوڈ میں تھے

بیٹھے بیٹھے اُن کو سُوجھی میری بھلائی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے

تیرے حکم بنا اے داتا پتّہ تک نہیں ہلتا ہے
میں تو جانوں تیرے ہی در سے مجھ کو سب کچھ ملتا ہے

تھینک یُو، تھینک یُو، تُو نے کرائی میری ٹھکائی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے

بچّوں کی توبہ

ہم نے بکری کے بچّوں کو کمروں میں نچانا چھوڑ دیا
ناراض نہ ہو امّی، ہم نے، ہر شوق پرانا چھوڑ دیا
ڈیڈی کے سوٹ پہن کر ہم صوفوں پر ڈانس نہیں کرتے
سارے گھر کی بنیادوں کو اب ہم نے ہلانا چھوڑ دیا
دادا ابّا کا اب چشمہ بکرے کو نہیں پہناتے ہم
نانا ابّا کی لٹھیا کو اب ہم نے چھپانا چھوڑ دیا
بندر کو سہرا باندھ کے ہم دُولھا نہ بنائیں گے امّی
اب گھونگٹ کاڑھ بندریا کو ڈولی میں بٹھانا چھوڑ دیا
ندیا کے گہرے پانی میں کھائے نہ کئی دن سے غوطے
گھر ہی میں پڑے اب کڑھتے ہیں ندیا پہ نہانا چھوڑ دیا
اب صبر کے میٹھے میٹھے پھل آہیں بھر بھر کر کھاتے ہیں
مالن کو بنا بیٹھے خالہ، مالی کو رُلانا چھوڑ دیا،

گھر میں بیٹھے سادھو بن کر اب علم کی مالا جپتے ہیں
خرگوشوں کے پیچھے جنگل میں کتّوں کو بھگانا چھوڑ دیا
پنجروں میں بند جو رہتی تھیں وہ پھر سے اُڑا دیں سب چڑیاں
مُرغوں میں صُلح کراتے ہیں، مُرغوں کو لڑانا چھوڑ دیا
اب ہم نے کبھی کھانا کھا کر کپڑوں سے ہاتھ نہیں پُونچھے
دیکھو کئی دن سے دھوبی نے رونا چلّانا چھوڑ دیا
ہر ایک بغاوت چھوڑی ہے ہر ایک شرارت رخصت ہے
اب گھر میں فرشتے آتے ہیں، شیطان نے آنا چھوڑ دیا
ہم سے پھر بھی ناراض ہو کیوں؟ کیا تم سوتیلی امّی ہو؟
اپنے ان پیارے بچّوں کو اب منہ بھی لگانا چھوڑ دیا
جن آنکھوں میں روز شرارت تھی اُن آنکھوں میں آنسو اب دیکھو
ان آپ کی پیاری آنکھوں کو اب ہم نے رُلانا چھوڑ دیا
ہے گھر کی فضا سہمی سہمی، غمگین ہیں بچّوں کے چہرے
کب ہنس کے کہو گی اے بچّو! کیوں ہم کو ستانا چھوڑ دیا!

ننھّی جوگن خدا کی تلاش میں

اے خدا جنگل میں چھُپ کر تجھ سے ملنے آئی ہوں
جیب میں تھوڑی مٹھائی بھی چھُپا کر لائی ہوں
تجھ کو کیا معلوم کتنا چاہتی ہوں میں تجھے
تجھ کو تھوڑا دیکھ لوں تو چین آ جائے مجھے
آسماں پر میں نے دیکھا دُور بینوں سے تجھے
ڈھونڈتی پھرتی ہوں پونے دو مہینوں سے تجھے
آسماں پر چاند تاروں کے سوا کچھ بھی نہیں
جنگلوں میں دیوداروں کے سوا کچھ بھی نہیں
جھاڑیوں میں بھی نہیں ہے تو وہاں خرگوش ہیں
تیری خاطر بن کے جوگی بن میں جو روپوش ہیں

میری امی باھد آ جاتی ہیں برقع اوڑھ کر
تو کبھی برقعے میں بھی آتا نہیں مجھ کو نظر
آج کل پردہ کوئی کرتا نہیں تیرے سوا
چھوڑنے والی ہیں اب امی بھی پردہ اے خدا
چوری چوری مجھ سے مل جا میں بہت ہی نیک ہوں
امی کہتی ہیں کہ لاکھوں لڑکیوں میں ایک ہوں
پورے پانچ آنے فقیروں کو میں دے کر آئی ہوں
ہاتھ میں چھوٹی سی اک تسبیح لے کر آئی ہوں
تجھ کو خوش کرنے کی خاطر جھوٹ بھی نہ بولا آج
کیا کروں جب اپنے سر پر رکھ لیا نیکی کا تاج
جنگلوں میں آ گئی سب اپنی گڑیاں چھوڑ کر
میں تو جوگن بن گئی ہوں تجھ سے ناتے جوڑ کر
چھُپ کے امی سے وظیفہ بھی پڑھا کل رات کو
تاکہ وہ سُن لیں نہ تیری اور میری بات کو

سات راتیں "توبہ استغفار" بھی پڑھتی رہی
آگے ہی آگے میں تیری راہ میں بڑھتی گئی
آدھی روٹی کھائی ہے اور ساتھ بس تھوڑی سی پیاز
آگئی ہوں بن میں لے کر اپنی ننھی "جانماز"
اِک اگر بتی بھی لائی ہوں ابھی سُلگاؤں گی
کر کے آنکھیں بند تیرے دھیان میں کھو جاؤں گی
آنکھ میں آنسو ہیں اور تیرے لئے ہے دِل اُداس
آبھی جا اب آبھی جا کوئی نہیں ہے آس پاس
لگ رہا ہے ڈر مجھے جنگل بہت سُنسان ہے
حوصلہ چھوٹا سا ہے، ننھی سی میری جان ہے
دیکھ کر مجھ کو اکیلی بھیڑیا گر آگیا!
اور اگر مجھ نگوڑی کو وہ ظالم کھا گیا
دیکھ کر چھوٹی سی یہ تسبیح اور یہ "جانماز"
تو بہت روئے گا اے میرے خدائے بے نیاز

پھر یہ سب چیزیں مری امّی کو تُو دے آئے گا
کچھ نہیں تو مُنہ سے بولے گا، تو روتا جائے گا،
تجھ سے جب پوچھیں گی امّی "کیا ہوا جی کیا ہوا؟"
دیکھ کر امّی کا چہرا اِتنا گھبرایا ہوا
تو نہیں یہ کہہ سکے گا تیری "بانو" مر گئی
میری خاطر اپنی ماں کی گود خالی کر گئی
روئے گا پچھتا کے جب تو جنگلوں میں بار بار
بھیڑیئے کے پیٹ میں روؤں گی میں بھی زار زار
کیسے پونچھوں گی تیرے آنسو بہت گھبراؤں گی
تو بُلائے گا، مگر کیسے میں باہر آؤں گی
اپنی اتنا چاہنے والی کو مت برباد کر
آسمانوں سے اُتر کر اب میرا دِل شاد کر
گر نہیں آتا تو پھر اِک کام کر دینا مرا
یہ ضروری کام ہے مت بھول جانا اے خدا

جب تجھے فرصت ملے امّی سے کہہ آنا کبھی
تھوڑی سی برفی منگا کر نیاز دلوا دے مری
اور فرشتوں سے بھی کہہ دینا میرے اچھے خدا
میرا نام اِس چھوکری نے آ کے جنگل میں لیا
بھیڑیے کے پیٹ سے جنّت میں لے جانا اِسے
بھول سے دھوکے سے دوزخ میں نہ پھینک آنا اسے

محترمہ مسز اُلّو اور اُن کے بچّے

(۱)

امّی، میں اور بھیّا کل اِک شاخ پہ بیٹھے اُونگھ رہے تھے
باغ کی بھینی بھینی خوشبو، چونچ سے اپنی سُونگھ رہے تھے
ہم پہ پسینے پھینک رہا تھا۔ دُور سے سُورج کالا کالا
آدھے سوئے تھے آدھے جاگے، دُور ابھی تھا رین اُجیالا
اتنے میں اِس پیڑ کے نیچے، آئے دو اسکول کے بچّے
ایک اشارا کر کے بولا "دیکھو دو اُلّو کے پٹھے!"
اُن کی گالی سُن کر امّی، رونے لگے ہم دونوں بھائی
بھاگ گئے "وہ دونوں" ڈر کر ہم نے ایسی راڑ مچائی

اپنی گول آنکھوں سے امّی ، ہم کوئی دو سو آنسو روئے
اوڑھ کے سپنوں والی چادر، اِلّو، پلّو آج نہ سوئے
امّی! ابّا تو کہتے تھے ۔ ہم دونوں اچھے بچّے ہیں،
پھر وہ بچّے کیوں کہتے ہیں" ہم دو اُلّو کے پٹھّے ہیں"؛

(۲)

"آؤ، اِدھر اے پیارے بچو! ماں تم پر اپنی جاں وارے!
پونچھ لو اپنی گول آنکھوں سے لمبے لمبے آنسو پیارے
سچ کہتی ہوں تم دونوں ہو۔ ایک حسین اُلّو کے بچّے
تم کو جو آکر دے گئے گالی ۔ وہ ہوں گے اُلّو کے پٹھّے!"

○

عہدِ جوانی ہنس ہنس کاٹا

نگوڑا

تو ہی جا کوٹھے پہ سوسن میں تو بس اب جا چکی
توبہ توبہ کون واں جائے گا میں باز آ چکی
جب بھی میں اُوپر ہوں جاتی
سامنے اُس کو ہوں پاتی
وہ نگوڑا مجھ کو تک کر جانے کیوں کہتا ہے "ہائے"
اب کہو سوسن کوئی کیا خاک اس کوٹھے پہ جائے
دس دفعہ میں کل گئی جب
کیا بتاؤں اُف مرے رب
دس دفعہ ہی میں نے پایا اُس کو اپنے سامنے
مجھ کو تک تک کر لگا کم بخت دل کو تھامنے

آ ذرا کوٹھے پہ جائیں
آ وہیں چُنری سکھائیں
اُس نگوڑے مردوے کو مُنہ لگائیں گے نہ ہم
وہ جدھر ہو گا اُدھر چُنری سکھائیں گے نہ ہم

○

پھول اَور کانٹا

جھٹپٹے کے وقت شیشم کے درختوں کے تلے
بل رہی تھی جب ہوا مسرور شاخوں سے گلے
جب زمینِ خلد منظر کیف سے معمور تھی
شام کی دیوی محبت کے نشے میں چُور تھی
شہر کی ویراں سڑک پر مجھ کو اِک لڑکی ملی
نیلگوں ملبوس میں مورت چھپی تھی نُور کی
ساتھ اپنے دُھول اُڑائے جس طرح سورج ہوا
جس طرح سے پھول کے ساتھ ایک کانٹا ہو لگا
تھام کر اُس مہ لقا کا عطر سے آلودہ ہاتھ
نوجواں بھی آ رہا تھا ایک اُس کے ساتھ ساتھ

بنتِ عم

لڑکا:۔ نہیں آتی تو کیا ہے، ہم تمہیں انگلش پڑھا دیں گے
کتابیں مت منگانا، سب کی سب ہم کل ہی لا دیں گے
لڑکی:۔ نہیں اس کی ضرورت کیا ہے، یہ تکلیف مت کیجے
مناسب ہے یہی، بی۔اے کا پہلے امتحاں دیجے
لڑکا:۔ کسی کی فکر میں کیوں آ رہے تم کو پسینے ہیں؟
ابھی تو امتحاں میں ٹھیک پونے نو مہینے ہیں
لڑکی:۔ جی ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن مجھے ڈیڈی پڑھا دیں گے
وہ کل ہی کہہ رہے تھے سب کتابیں مجھ کو لا دیں گے
لڑکا:۔ انہیں فرصت کہاں ہے، کیوں انہیں تکلیف دیتی ہو؟
میں جب کہتا ہوں تم کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہو

لڑکی :- بہت رہتی ہے جھنجھٹ دھاڑ سب بچوں کی اِس گھر میں
پڑھے گا خاک کوئی اِتنا واویلا ہو جس گھر میں

لڑکا :- ارے ہر شام کُنجِ باغ میں ہم بیٹھ جائیں گے
اُٹھے آندھی یا طوفاں ہم تمہیں انگلش پڑھائیں گے

لڑکی :- اجی چھوڑو یہ باتیں اپنا دِل تُم کر چکے ہو گُم
کہو نا صاف! مجھ سے عشق کرنا چاہتے ہو تُم!

○

درزن اور لارڈ کرزن

سرور :- اِدھر دیکھئے اِک نظر بندہ پرور
کہ ملنے کو تشریف لائے ہیں سرور
ذرا اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا کر
ہمیں دیکھئے اِک نظر مسکرا کر
یہ "دیوانِ غالب" یہ دیوانِ حالی"
یہ ہے داستانِ "امامِ غزالی"
تلاش اِن کی کرتا رہا ہوں مہینوں
بڑی مشکلوں سے ملی ہیں یہ تینوں
میں بارش میں بھی آج پھرتا رہا ہوں
میں کیچڑ بھری سڑکوں پہ گرتا رہا ہوں

نہ محبتوں کبھی کٹھن کام کرتا
کہ وہ ایسے موسم میں آرام کرتا
مگر میں چراغِ محبت جلا کر
انہیں ڈھونڈ لایا اندھیروں میں جا کر
بس اب مجھ سے تم "شکریہ" تک نہ کہنا
اسی طرح بے درد خاموش رہنا
جب آیا انہیں گھر میں مصروف دیکھا
انہیں "دفترِ دل" سے "موقوف" دیکھا
مشینوں پہ کپڑے سئے جا رہے ہیں
رومالوں پہ بخیئے کیے جا رہے ہیں
جہیز اپنا سینا ادی اسے جینا
مگر میرا چاکِ گریباں نہ سینا
ارے اس مشیں کو میں کھڑکی سے پھینکوں
ہوئی کتنے ٹکڑے؟ میں اوپر سے دیکھوں

یہ "ڈرکوپ" ہے اور ڈرپوک ہوں میں
مگر پھینک دینے پہ پرووک ہوں میں
ہنساتا ہوں تم کو تو ہنستی نہیں ہو
پھنساتا ہوں تم کو تو پھنستی نہیں ہو
ارے میرے اللہ بڑی ہے یہ پکی
نہیں چل سکے گی محبت کی چکی"
نگاہیں اٹھا کر اِدھر دیکھ درزن
کھڑا ہے تیرے سامنے لارڈ کرزن

رضیہ :- چلو چھوڑو مسٹر یہ بکواس کب تک
تم اس گھر میں تڑپو گے بے آس کب تک
کبھی لڑکیاں ایسے پھنستی نہیں ہیں
ہنساؤ تو بے درد ہنستی نہیں ہیں

بڑا ہے محبت میں ڈائرکٹ ہونا
پسند آکے بھی آپ ایسے ریجکٹ ہونا

سرور:- یہ کمرے میں کتنی ہوا آرہی ہے
یہ زلفوں کو بیکار اُلجھا رہی ہے
کہو تو میں کھڑکی کا پردہ گرادوں؟
قریب آکے چہرے سے زلفیں ہٹادوں؟
یہ کمبخت کتنا اُلجھتی ہیں تجھ سے
اُلجھنا یہ تجھ سے اُلجھنا ہے مجھ سے
مچلتا رہوں کب تلک دُور رہ کے
قریب آؤں میں ایک دو تین کہہ کے؟

○

رضیہ:- کم از کم رہو سو قدم دُور مجھ سے
چپت ورنہ کھاؤ گے بھرپور مجھ سے

چلے آئے پھر عشق کا ساز لے کر
بُلاؤں میں امّی کو آواز دے کر؟
امّی دیکھئے یہ ... ...

... ...

سرور:- ارے رے رے رے خاموش بس بس
ابھی بس ابھی جا رہا ہوں میں واپس
میرے عشق کو پاؤں سے تم رگیدو
مگر ان کتابوں کی "قیمت" تو دے دو
مگر یاد رکھّو کہ قیمت بڑی ہے،
ہے برکھا کا موسم ملن کی گھڑی ہے

رضیہ:- یہ برکھا کا موسم جہنّم میں جائے
نہ "شیطاں" کوئی میری "جنّت" میں آئے
مجھے یاد ہے کل درختوں کے پیچھے
گھنی "عشق پیچاں" کی بیلوں کے نیچے

لیا تھام جب تم نے اِک ہاتھ میرا
ستایا بہت، مجھ کو جی بھر کے چھیڑا،
بہت کچھ تمہیں پیشگی دے چکی ہوں
نہ پھر مانگنے کی قسم لے چکی ہوں
لئے اپنا دل بھاگ جا لارڈ کرزن
نہیں تو تمہیں پیٹ دے گی یہ دُرزن

بھائی بہن

لے کے اپنی اداؤں کے لشکر — وہ دبے پاؤں گھر سے آتی ہے
چاند حیرت سے اُس کو تکتا ہے — سوچتا ہے کدھر یہ جاتی ہے

گلستاں کی حسیں ہواؤں میں — اس کی ہر اک مراد کھلتی ہے
دن میں کہتی ہے جس کو وہ بھائی — رات کو چھُپ کر اُس سے ملتی ہے

فیصلہ

محبت کروں تجھ سے میں اے حسینہ؟
مگر میری صورت کچھ اچھی نہیں ہے
یہی سوچتا ہوں کہ دوں پھر بھی کوشش
مگر تیری صورت کچھ اچھی نہیں ہے
چلو پھیر لیں اب اپنی اپنی نگاہیں
نہ تم ہم کو چاہو نہ ہم تم کو چاہیں

○

آخری گالی

پھر وہی چھیڑیں پیار کی باتیں آپ نہیں باز آئیں گے؟
دیکھئے ہم اُٹھ کر چل دیں گے، آپ نہیں گر جائیں گے
قوسِ قزح چولہے میں جلائے کالی گھٹا کو آگ لگے
کیا ہم دیکھ نہیں سکتے ہیں؟ آپ ہمیں دکھلائیں گے؛
آنکھیں ہماری اچھی ہیں تو آپ کو ان سے کیا مطلب
جیسی بھی ہیں آپ اب اِن کے پیچھے ہی پڑ جائیں گے؟
آپ نے تصویریں مانگی تھیں ہم نے بس یوں ہی دے دیں
کیا معلوم تھا آپ اب ان سے دل کا محل سجائیں گے
بُری بُری نظریں چہرے پر ڈال رہے ہیں اُف توبہ!
ہم اپنے دونوں گالوں کو جا کے ابھی دھو آئیں گے

اتنے لمبے لمبے خط ہم کیسے پڑھیں ہائے اللہ،
جب بھی آئیں گے ساتھ اپنے کوئی مصیبت لائیں گے

ہم پہ آپ نے نظمیں لکھ دیں، اس پہ بھی ہم خاموش رہے
نظموں کے بعد آپ تو ہم پر نثر بھی اب چپکائیں گے

یہ جھمکے، یہ سینٹ، یہ نظمیں عشق کا سب سازوساماں
اب واپس لے جائیے صاحب بس میں نہیں ہم آئیں گے

ہم کہتے ہیں شہر میں ہوں گی نو سو لڑکیاں کم سے کم
یہ کیا ضد ہے پیار کی مالا ہم ہی کو پہنائیں گے

کر لیجے رضیہ سے محبت ہم پہ کیجے نظرِ کرم
وہ بیچاری پھنس جائے گی ہم اُس کو سمجھائیں گے

عظمت بھی اچھّی خاصی ہے اُس سے لڑا لیجے آنکھیں
آپ اِس بندی کی خاطر کب تک زحمت فرمائیں گے

خالہ صاحب آتے ہیں تو کیسے کہیں ہم "مت آؤ"
آتے ہیں تو ہم کیوں روکیں کھا تو نہیں وہ جائیں گے

دیکھئے ہاتھ لگایا تو ہم ڈر کر شور مچا دیں گے
امّی، ابّا، پھپھّو، خالہ، دوڑ کے سب آجائیں گے

پہلے ہم کو بہن کہا۔ اب فکر ہمیں سے شادی کی
یہ بھی نہ سوچا بہن سے شادی کر کے کیا کہلائیں گے؟

○

مولوی صاحب کا خواب

دیکھا مَیں نے جس کو چھُپ کے
اپنے حجُرے کی کھڑکی سے
جس کے لئے تعویذ کرائے
ندی نالوں میں ڈلوائے

اُس کے گھر میں جا پہنچا ہوں
بالکل اُس کے پاس کھڑا ہوں
گھر میں بیٹھی ہے وہ اکیلی
ماں ہے پاس، نہ کوئی سہیلی

پردہ اُس نے چھوڑ دیا ہے
بُرقعہ اُس کا دُور گرا ہے

چہرے پہ خوشبودار پسینہ
اُلھڑ جوبن، باغی سینہ

گوری گوری چنچل باہیں،
وصل کی خواہاں شوخ نگاہیں

سر پہ لا کر ہاتھ حنائی
لے کر اک دل پھینک انگڑائی

کہتی ہے "چھوڑو قاضی واضی
میں بھی راضی، تم بھی راضی!"

ادیب کی محبوبہ

تمہاری اُلفت میں ہارمونم پہ میرؔ کی غزلیں گا رہا ہوں
بہتّر اِن میں چھپے ہیں نشتر، جو سب کے سب آزما رہا ہوں

بہت دنوں سے تمہارے جلوے خدیجہؔ مستور ہو گئے تھے
ہے شکرِ باری کہ سامنے اپنے آج پھر تم کو پا رہا ہوں

لحاف عصمتؔ کا اوڑھ کر تم فسانے منٹوؔ کے پڑھ رہی ہو
پہن کے بیدیؔ کا "گرم کوٹ" آج تم سے آنکھیں ملا رہا ہوں

تمہارے گھر ن۔م۔ راشدؔ کا لے کے آیا سفارشی خط
مگر تعجب ہے پھر بھی تم سے نہیں میں کچھ فیضؔ پا رہا ہوں

بہت ہے سیدھی سی بات میری نجانے تم کیوں نہیں سمجھتیں
قسم خدا کی کلامِ غالبؔ نہیں میں تم کو سنا رہا ہوں

تمہاری زلفِ سیہ پہ تنقید کس سے لکھواؤں تم ہی بولو
نثری عبادتؔ بریلوی کو میں تار دے کر بلا رہا ہوں

میں تم پہ ہوں جاں نثار اخترؔ قسم ہے منشی فدا علیؔ کی
بہت دنوں سے میں تم پہ ساحرؔ سے جادو ٹونے کرا رہا ہوں

اگر ہو تم ہاجرہؔ تو پھر مجھ سے مل کے مسرور کیوں نہیں ہو؟
تمہارے آگے اُپیندر ناتھ اشکؔ ہی کے آنسو بہا رہا ہوں

حسین ہو زہرہ جمال ہو تم، مجھے ستا کر نہال ہو تم
تمہارے یہ ظلم قرۃ العینؔ کو بتانے میں جا رہا ہوں

میری محبت کی داستاں سُن کے رو پڑے جوشِ ملسیانی
ٹکھا کے پنکھے سے اُن کے آنسو ابھی وہاں سے میں آ رہا ہوں

پلا دو آنکھوں سے، تا کہ مجھ کو بھی آلِ احمد سرورؔ آئے
بہت ہیں غم مجھ کو عاشقی کے، پیے بنا ڈگمگا رہا ہوں

میری تباہی پہ چھاپ دیں گے نقوشؔ کا ایک خاص نمبر
طفیلؔ صاحب کے پاس سارے مسودے لے کے جا رہا ہوں

وزیر آغا پٹھان ہیں ساتھ یاروں کے یار بھی ہیں
پکڑ کے وہ تم کو پیٹ دیں گے، میں کل انہیں ساتھ لا رہا ہوں
حکیم یوسف حسن نے جب میری نبض دیکھی تو رو کے بولے
جگر ہے زخمی تباہ گُردے یہ بات تم سے چھپا رہا ہوں
ملیح آباد آج جا رہا ہوں میں جوشؔ لاؤں کہ آم لاؤں؟
ہیں دونوں چیزیں وہاں کی اچھی، میں لاؤں کیا تلملا رہا ہوں
جو حکم دو واجدہ تبسّم کا کچھ تبسّم میں تم کو لا دوں
تمہارے ہونٹوں پہ غم کی موجوں کو دیکھ کر تلملا رہا ہوں
فسانہ عشق مختصر ہے، قسم خدا کی نہ بور ہونا
فراقؔ گورکھپوری کی غزلیں نہیں میں تم کو سنا رہا ہوں
میری محبت کی داستاں کو گدھے کی مت سرگزشت سمجھو
میں کرشن چندر نہیں ہوں ظالم یقین تم کو دلا رہا ہوں!

○

ضرورت رشتہ اور تصویریں

(۱)

ممی اُس سے نہیں، توبہ! کروں گی قدر خاک اس کی
مجھے لگتا ہے ڈر اس سے بہت لمبی ہے ناک اس کی
ہوئی شادی تو پہلا کام؟ میں ڈائی وورس مانگوں گی
میں اُس کی ناک پر کیا اپنا اوور کوٹ ٹانگوں گی
نہیں بابا، نہیں بابا،

(۲)

یہ اچکن پہنے بیٹھے ہیں غلط بولیں گے انگریزی
ہلاکو جیسی آنکھیں ہیں نگاہیں ان کی چنگیزی
میں کوئی مُلک ہوں جو مجھ پہ حملہ کرنے آئے ہو

میاں جاؤ - میں اِک تلوار ہوں کیوں مرنے آئے ہو
نہیں بچتے، نہیں بچتے -

(۳)

"وٹامن بی" کی کچھ اس میں کمی معلوم ہوتی ہے
میرے اللہ نبض اس کی تھمی معلوم ہوتی ہے

میں بیٹ کرتی ہوں امّی ہوگا یہ بیمار برسوں سے
بچارا مطمئن ہوگا کم از کم چار برسوں سے
نہیں امّی، نہیں امّی -

(۴)

بہت خط اس نے بھیجے ایک بھی بھیجا نہ لَو لیٹر
میں پچھلے ویک اس سے کر چکی ہوں ڈراپ یہ میٹر
میاں تم مشرقی اور مغربی ہے خاندان اپنا
میں باز آئی محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا
نہیں جچتے، نہیں جچتے

(۵)

ممی غنڈہ ہے یہ اور نام ہے بی اے شریف اس کا
شراب اور بدمعاشی میں نہیں کوئی حریف اس کا
اِدھر یہ ڈال کر ڈورے مجھے اپنا بنا لے گا
ہو تم بھی خوبصورت، یہ نظر تم پر بھی ڈالے گا
اری لڑکی - اری لڑکی" -

(۶)

نگاہیں نیچی نیچی نام ہے ایم اے لطیف اس کا
خدایا توبہ توبہ جسم ہے کتنا نحیف اس کا
میری نظروں کا پہلا تیر بھی یہ سہہ نہیں سکتا
یہ مر جائے گا بیچارہ یہ زندہ رہ نہیں سکتا
چلو آگے، چلو آگے،

(۷)

یہ اس کے منہ پہ "مشر ڈُر پھٹے منہ" کس نے لکھ ڈالا؟
یہ میرا کام تھا لیکن شرارت کر گئی خالہ

ذرا ٹھیرو میں اس کے ساتھ خالہ کو پھنساؤں گی
اِسی خالہ کو "بیگم دُر پھٹے مُنہ" میں بناؤں گی
"اری لڑکی - اری لڑکی"۔

(۸)

یہ ایل ایل بی ہے پر اللہ بچائے اِن وکیلوں سے
یہ ہر اک بات منوائے گا قانونی دلیلوں سے
مجھے ڈائی ووُرس یہ بائی فورس دے سکتا ہے حیلوں سے
میرا گھر لُوٹ لے گا قربتوں سے اور اپیلوں سے
نہیں دیکھو، پرے پھینکو۔

(۹)

یہ شاعر ہے یہ ہر لڑکی کو آہیں بھر کے تکتا ہے
جب اُکتا جائے گا کہہ دے گا "میڈم تجھ میں" سکتا ہے"
کرے گا شاعری دن بھر نہیں پیسہ کمائے گا
یہ بھوکا رہ کے راتوں کو گرہ مجھ پر لگائے گا
نہیں امّی - نہیں امّی۔

(۱۰)

ارے یہ ڈاکٹر نبضیں حسینوں کی ٹٹولے گا
گنے گا دھڑکنیں دل کی، گریبانوں کو کھولے گا
شریکِ زندگی بن کر میں جینے کو تو جی لوں گی
جو اس پہ شک ہوا میں ٹنکچر آیوڈین پی لوں گی
نہیں بابا، نہیں بابا

(۱۱)

ممی اب بس کرو بَس بَس غلط ہیں سب یہ تدبیریں
محبّت میں نہ کام آتیں ہیں تصویریں نہ تقریریں!
جو سچ پوچھو خراب عشق سِپ کرتی رہی ہُوں میں
وُہی اچھا ہے جس سے کورٹ شِپ کرتی رہی ہوں میں
بہت اچھّا
بہت اچھّا

○

ایک اور ضرورتِ رشتہ اور تصویریں

(۱)

پولیس کپتان کی پوتی ہے یہ۔ اس سے نہیں امی
جہاں ڈانٹا، پولیس آجائے گی فوراً وہیں امی
ذرا "فوں فوں" کیا تو اپنے ڈیڈی کو بتا دے گی
یہ خود باہر رہے گی اور مجھے اندر کرا دے گی
نہیں امی، نہیں امی

(۲)

ممی یہ وہ ہے جو پٹنے میں ہاکی میچ کھیلی تھی
خوشی سے شیخ کی موٹر میں اس نے لفٹ لے لی تھی
وہ اس گوری پہ کالا ہاتھ اپنا دھر چکا ہوگا
وہ موقع پا کے موٹر میں اسے کِس کر چکا ہوگا
نہیں امی، نہیں امی

(۳)

عدالت حسن کی ہے، بن کے مجسٹریٹ بیٹھی ہیں
یہ شادی کے لئے "ملزم" کو دینے ڈیٹ بیٹھی ہیں
چھوا اِن کو تو بولیں گی "رذالت کر رہے ہو تم"
پرے ہٹ جاؤ توہینِ عدالت کر رہے ہو تم
نہیں امی، نہیں امی

(۴)

ممی کیا یہ وہی ہے جس کی تم ہو عاشق و شیدا
یہ ہندی ہو کے کیوں انگلینڈ میں جا کر ہوئی پیدا
سوئٹزرلینڈ میں ہے باپ، امریکہ میں ماں اس کی
"چمن" میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں اس کی
نہیں امی، نہیں امی

(۵)

بھویں تنتی ہیں کُتا ساتھ میں ہے تن کے بیٹھی ہیں
کلامِ داغ شاید پڑھ کے یہ بن ٹھن کے بیٹھی ہیں

کہیں گی میرے کُتّے کے لئے بھی پارٹنر لاؤ
کسی کا فرہاد کی "دید" سے اِس کو بھی بہلاؤ
نہیں امّی، نہیں امّی

(۶)

سُنا ہے فلم میں بھی یہ حسینہ کام کرتی ہے
نہ جانے ایک دن میں کتنے دِل نیلام کرتی ہے
جو ہیرو مل گیا کوئی مجھے وِلین بنا دے گی
یہ دو ہی چار سینوں میں مجھے گھر سے بھگا دیگی
نہیں امّی، نہیں امّی

(۷)

ارے اس کو تو اُس دن پارٹی میں ہم نے دیکھا تھا
کسی لڑکے نے اِس پر دُور سے اک پھُول پھینکا تھا
یہی تھے ٹاپس کانوں میں، یہی ٹیٹو کی ساری تھی
نظر سب سے بچا کر اِس نے مجھ کو آنکھ ماری تھی
نہیں امّی، نہیں امّی

(۸)

ہے ریکٹ ہاتھ میں، کیا بیڈ منٹن اس نے سیکھی ہے
تتیّا مرچ کی مانند کتنی تیکھی تیکھی ہے
اسی ریکٹ سے اک دن میرا قِصّہ پاک کر دے گی
یہ میرے عشق کو دو دن میں فسٹ ٹیبل کاک کر دے گی
نہیں امّی، نہیں امّی

(۹)

دکن کی جادو گرنی آئی دامِ زلف کو کھولے
کہے "قینچی" کو "خینچی" اور "قسم" کو یہ "خصم" بولے
قسم کھانے کے دھوکے میں "خصم" شاید یہ کھا جائے
میری امّی جوانی میں نہ مجھ کو موت آ جائے
نہیں امّی، نہیں امّی

(۱۰)

سُنا ہے فنِ موسیقی میں ماہر ہے یہ نیک اجلا
کہے گی مجھ سے "میں گاؤں گی تم چھیڑو ذرا طبلا"

میرے گھر کی چھتیں اُڑ جائیں گی سب اسکی تانوں سے
نہ سارنگی جدا میں کر سکوں گا اس کی رانوں سے
نہیں امّی، نہیں امّی

(۱۱)

غزالی آنکھ، چہرہ پھول، شرمیلی نظر اس کی
حسیں گالوں پہ دو دو تل ہیں اور غائب کمر اسکی
ممّی یہ سروقد لڑکی نہیں میرے نصیبوں میں
یہ بٹ جائے گی فوراً شاعروں میں اور ادیبوں میں
نہیں امّی، نہیں امّی

(۱۲)

کھڑی ہے ریگِ ساحل پر - امیرُ البحر کی پوتی
صراحی دار گردن میں ہیں کچھ مرجان، کچھ موتی
میرے دل کے سفینے کو چٹانوں سے نہ ٹکرا دے
کسی ملّاح سے مجھ کو سمندر میں نہ پھکوا دے
نہیں امّی، نہیں امّی

(۱۳)

ممّی اب تو سمندر ہی میں پھینک آؤ یہ تصویریں
نہیں ڈالو میرے قدموں میں تم شادی کی زنجیریں
جو سچ پوچھو - یہ سب شادی نہ کرنے کے بہانے ہیں
مچلتا تیر ہوں سب لڑکیاں میرے نشانے ہیں
مجھے دنیا کی ہر لڑکی حسیں معلوم ہوتی ہے
ہر اک صورت مجھے سحر آفریں معلوم ہوتی ہے
اگر ان لڑکیوں میں ایک سے شادی کروں گا میں
یقیں ہے مجھ کو، باقی کے لئے آہیں بھروں گا میں
کہو اب تم ہی امّی میں کرونگا کس طرح شادی
میں ڈیڈی کی طرح ہرگز "قناعت" کا نہیں عادی
"ارے لڑکے ارے لڑکے"

غنڈے

تاش کے پتے پھینکو یارو — تاش کے پتے پھینکو یار
سامنے دیکھو کون آتی ہے — کر کے سات سنگار
تاش کے پتے پھینکو یارو — تاش کے پتے پھینکو یار

پہچانا؟ ہے کون حسینہ؟
تھام لو اپنا اپنا سینہ!
لنگڑے سیٹھ کی یار آتی ہے
ہفتے میں دو بار آتی ہے
چوڑیوں کی جھنکار سناتی
پائلیا کے گیت سناتی

آتی یہ ہر بار ہے یارو — کر کے سات سنگار

تاش کے پتے پھینکو یارو — تاش کے پتے پھینکو یار

سینے کا گلزار کھلاتی
ڈالی کی سی کمر لچکاتی
آج تو آتی ہے وہ اکیلی
ساتھ نہیں ہے اسکی سہیلی
کیوں بے تیلی اونگھ رہا ہے؟
اُس کی خوشبو سونگھ رہا ہے؟

جب وہ آئے، کہہ کے "ہائے" — آنکھ تو اُس کو مار
تاش کے پتے پھینکو یارو — تاش کے پتے پھینکو یار

ایک آنکھ والا

لے کے بیڑی کا ایک لمبا کش ایک چابک لگا کے گھوڑے کو
تانگے والا میرا لگا کہنے دیکھ کر اک حسین جوڑے کو

بابو جی ایک دن کا ذکر ہے یہ میں نے ریشم کی شہدی لنگی
آنکھ پہ کچھ جھکا کے باندھی تھی "یہ میری آنکھ" چھپ گئی سی تھی

منہ میں قینچی کا ایک سگرٹ تھا کان میں عطر کی پھریری تھی
کسی معشوق کو تنِ تنہا ڈھونڈتی ہر نگاہ میری تھی

اس سڑک پر اس "آنکھ" نے دیکھا چلبلی پیاری اک حسینہ کو
"آجا کر بیٹھ ادھر ذرا!" کہہ کے ماردی آنکھ اس لعینہ کو

اپنے گورے سے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر جما دیا اس نے
یوں لگا جیسے گرم اک بوسہ میرے منہ پر لگا دیا اس نے

اس حسیں ہاتھ کی حسیں خوشبو اب بھی آتی ہے سونگھ لیتا ہوں
دو گھڑی بند کر کے میں آنکھیں اپنے تانگے میں اونگھ لیتا ہوں

اور کیا چاہیے تھا بابو جی

○

اس سے اور اُسی سے

(۱)

زمیں کے چاند ترا حُسن آسمانی ہے
ہر ایک جلوہ ترا اک نئی کہانی ہے
ہے تیرے جلووں سے رخشندہ میری عمر کی رات
زہے نصیب کہ تُو ہو مری شریکِ حیات
ہے میرے اُجڑے ہوئے گھر کو انتظار ترا
تو اے بہار اسے آ کے رشکِ خُلد بنا
گھر آؤں گا جو سرِ شام ہو کے میں بے حال
نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھول سے گال
گلے میں ہوں گے مرے ہار تیری باہوں کے
چمک اٹھیں گے ستارے تری نگاہوں کے

کرے گی زندہ مجھے تیری دلنشیں گفتار
مرے چمن میں رہے گا سدا یہ حُسنِ بہار
کھِلے گی دل کی کلی رُوح شادماں ہوگی
بہشت ہوگی اُسی گھر میں تُو جہاں ہوگی
قدم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

(۲)

خدا کے واسطے کھولو بھی آ کے دروازہ
میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چیخ رہا
اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاجِ شریف
تو پنکھا جھلئے ذرا اُٹھ کے کیجئے تکلیف
یہ چارپائی مری ٹیڑھی کیوں بچھائی ہے؟
بھلا اِکنّی یہ کیوں فرش پر گرائی ہے؟
الٰہی کون یہ پانی کا دے گا اتنا بل؟
خُدا کے واسطے کر نل کو بند اے کاہل

پچیاتیاں میرے اللہ سب کی سب کچی!

تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچی،

نمک کی کان اُلٹ دی ہے آج سالن میں

اُٹھا پیالہ پٹخ دے یہ جا کے آنگن میں

بس اُٹھ بھی اب کوئی ایسا بُرا تو حال نہیں

یہ مجھ غریب کا گھر ہے یہ ہسپتال نہیں

دبا رہے ہیر میرے اُٹھ کے! اُٹھ بھی اُٹھ ارے سُست!

○

میاں کے دوست

آئے میاں کے دوست تو آتے چلے گئے

چھوٹے سے ایک گھر میں سماتے چلے گئے

وہ قہقہے لگے کہ چھتیں گھر کی اُڑ گئیں

بُنیاد سارے گھر کی ہلاتے چلے گئے

بکواس اُن کی سُن کے شیاطین رو پڑے

رویا جو ایک سب کو رلاتے چلے گئے

نوکر نے آج چائے کے دریا بہا دیئے

دریا سمندروں میں سماتے چلے گئے

الماریوں میں سہم گئے بسکٹوں کے ٹِن

چُن چُن کے ایک ایک کو کھاتے چلے گئے

کھانے کی چیزیں نادر و نایاب ہو گئیں
دِلّی کا قتلِ عام مچاتے چلے گئے

شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے آ کے میز پر
جو چیز بھی ملی، وہ چباتے چلے گئے

جیسے پولیس مین پکڑتا ہے چور کو
ہر شے پکڑ کے پیٹ میں لاتے چلے گئے

انجن کی طرح مُنہ سے اُگلتے رہے دُھواں
اور سگرٹوں کی راکھ گراتے چلے گئے

ہر سمت پھینک پھینک کے ماچس کی تیلیاں
کوڑے کا فرش گھر میں بچھاتے چلے گئے

کمرے میں گھومتے ہوئے کیچڑ بھرے وہ بُوٹ
قالین کے نصیب جگاتے چلے گئے

دیواروں سے ٹِکے رہے، چُپڑے ہوئے وہ سر
"ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتے چلے گئے"

آوازیں "آخ تھوخ" کی ہوتی رہیں بلند
سوئے ہوئے گلوں کو جگاتے چلے گئے

کوئی کتاب اپنے ٹھکانے نہ رہ سکی
ہندی کو فارسی میں ملاتے چلے گئے

اخباروں کی وہ دھجیاں بکھریں کہ کیا کہوں
اب ان سے وہ نگاہ کے ناتے چلے گئے

دیواریں وہ نہیں رہیں وہ در نہیں رہا
جس گھر پہ مجھ کو ناز تھا وہ گھر نہیں رہا

○

بیوی کی سہیلیاں

آئی جو ایک اور بھی آتی چلی گئیں
چھوٹے سے ایک گھر میں سماتی چلی گئیں

بچوں کی فوج لے کے ہوئیں گھر پہ حملہ زن
"ہم دشمنوں" کے ہوش اُڑاتی چلی گئیں

غنچہ دہن اُگلتے رہے دُودھ بار بار
یہ بار بار دُودھ پلاتی چلی گئیں

ننھوں نے ڈرائنگ روم میں دریا بہا دیئے
دریاؤں میں یہ بند لگاتی چلی گئیں

بچوں نے چھیڑے ناک سے نغمے سُرڑ سُرڑ
ناکیں پکڑ کے "چھوں" یہ کراتی چلی گئیں

دیوار پر جہاں بھی سفیدی نظر پڑی
کتّے کے پھول اُس پہ بناتی چلی گئیں

اوراق ہر کتاب کے اُلٹے لگا کے تھوک
پیکوں کی مُہر ان پہ لگاتی چلی گئیں

کھینچے انھوں نے آ کے میرے ریڈیو کے کان
چاروں طرف سے اُس کو بجاتی چلی گئیں

کھانے میں نقص انھوں نے نکالے ہزار ہا
ہر ناپسند چیز کو کھاتی چلی گئیں

بولی جو ایک "کائیں" تو سب بولی "کائیں کائیں"
پھر "کائیں کائیں کائیں" سناتی چلی گئیں

اس گھر میں آ کے کھُلنے لگے سب گھروں کے راز
پردے پڑے ہوئے تھے اُٹھاتی چلی گئیں

ہر ایک کا تھا یاد انھیں شجرۂ نسب
ہے کون کس کا باپ؟ بتاتی چلی گئیں

ہمسائیوں کے سر کی حجامت کے بعد بھی
قینچی زبان کی یہ چلاتی چلی گئیں
ہر سال اِن کی عمر گھٹی چار پانچ سال
ہر سال "عمرِ غیر" بڑھاتی چلی گئیں
دُلہن کی طرح گھر تھا ہمارا سجا ہُوا
بیوہ کی طرح اِس کو مٹاتی چلی گئیں
سدرو کے آج مانگ رہا ہوں یہی دُعا
اِس گھر میں یہ بلائیں نہ پھر آئیں اے خُدا

○

سُسرال کی جیل

(ایک قیدی بہو کی فریاد)

کیا لکھوں امّی آپ کے خط کے جواب میں
کب سے ہُوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
سُسرال والوں نے مجھے ڈالا عذاب میں
یُوں دب گئی ہوں جیسے وَرَق ہو کتاب میں
جمنا کی موج رہ نہیں سکتی حباب میں
میں ہوں "سمندِ ناز" پہ پا ہے رکاب میں
کل مجھ سے سچ کہا چچا غالب نے خواب میں
"جلتی ہے خوئے ساس سے نارِ التہاب میں"

لیوے نہ میرا نام "ستم گر" کہے بغیر
سوتی نہیں کبھی مجھے "کافر" کہے بغیر

کہتی ہے آگئی مرے گھر پر کہے بغیر
بستر بچھا دیا مرے در پہ کہے بغیر
آفت یہ آگئی مرے سر پر کہے بغیر
کیوں روز مجھ سے لیتی ہے ٹکر کہے بغیر
کیوں ڈالتی ہے چائے میں "شکر" کہے بغیر
میں تجھ کو کھینچ ماروں گی پتھر کہے بغیر

پتھر جو ماروں میں تو نہ رونا جواب میں
رہ ایسے جیسے پاؤں رہے ہے جراب میں

ہنستی ہوں جب ذرا "رخِ دلدار" دیکھ کر
روتی ہے میری ہمتِ دیدار دیکھ کر
جلتی ہے میری تابشِ رخسار دیکھ کر
کڑھتی ہے میری چلبلی رفتار دیکھ کر
ہنستی ہوں میں یہ ساس کے اطوار دیکھ کر
جیسے شہید ہنستا ہے تلوار دیکھ کر

یہ ساس ہے کہ شیر چھپا ہے نقاب میں
اللہ کسی کو ساس نہ دیوے شباب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
سوتی ہے وہ سنبھالتی ہوں سارے گھر کو میں
بلو کو چپ کراؤں کہ ماروں قمر کو میں
فرشِ زمین دھوؤں کہ مانجوں لگر کو میں
کیوں اپنا گاؤں چھوڑ کے آئی نگر کو میں
رو رو کے یاد کرتی ہوں فادر مدر کو میں
دکھتی ہے ساس ہی مجھے دیکھوں جدھر کو میں
ہر اک سے پوچھتی ہوں کہ دیکھوں کدھر کو میں
نازو ادا سے تھام کے اپنی کمر کو میں
جب اپنے دکھ سناؤں قمر کے پدر کو میں
کہتے ہیں "دیکھ آگ لگا دوں گا گھر کو میں
سنتا نہیں ہوں دکھڑے کسی کے سحر کو میں

گھائل کروں گا دل کو نہ زخمی جگر کو میں
اے کاش جانتا نہ تیری رہگذر کو میں

اچھا یہی ہے ڈھونڈ لے راحت عذاب میں
اماں کا ذکر کفر ہے میری جناب میں

دیوروں سے بھی ہیں بڑھ کے میری دیورانیاں
پیپر میں چھاپ دوں گی میں اِن کی کہانیاں
"پچھلی طرف کو پاؤں" ہیں اِن کی نشانیاں
چولھے میں جائیں اِن کی یہ ظالم جوانیاں
کرتی ہیں راج گھر پہ یہ شیطاں کی نانیاں
اس گھر میں فٹ ہیں جیسے گھڑی میں کمانیاں
جادوگروں سے سیکھ کے جادو بیانیاں
کرتی ہیں مجھ غریب پہ یہ ظلم رانیاں
کیا لکھوں اُن کی مجھ پہ ہیں کیا مہربانیاں
ہر بات میں دکھاتی ہیں یہ نکتہ دانیاں

اِک دو نہیں ہیں خیر سے چودہ ہیں رانیاں
شام و سحر یہ کرتی ہیں ریشہ دوانیاں

رہتی ہوں رات دن میں اسی پیچ و تاب میں
پہنچا دیں سائنس دان انہیں ماہتاب میں

نندوں کی ہر نگاہ جگر تک اُتر گئی
اپنے خسر کی ڈانٹ میں سنتے ہی ڈر گئی
پہلی بہو تو خیر سے اللہ کے گھر گئی
ہنس ہنس کے جینے آئی تھی رو رو کے مر گئی
آئے گی تیسری بھی اگر ہیں گزر گئی
"اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی"
کہتے ہیں تڑ کے تڑکے "بہو کیا تو مر گئی؟
اُٹھو بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی"

دیور ہیں یا کہ زہر ملا ہے گلاب میں
جیٹھوں کا ذکر بھول گئی اضطراب میں

دو ہمسائیاں

شکیلہ:۔ تمہارے بچے ہماری بلی کی دُم پکڑتے ہیں اِن کو روکو
تمہارے مُرغے ہماری چھت پر اذان دیتے ہیں اِن کو ٹوکو

عقیلہ:۔ تمہارا بکرا ہمارے آنگن میں آگھسا تھا ہلا کے ڈاڑھی
دو ہتڑوں سے اُسے بھگایا وہ جا رہا تھا اُٹھا کے ساری

شکیلہ:۔ تمہاری بچی ہماری نانی کو "پوپلی" کہہ کے بھاگ جائے
تمہارا بچہ ہمارے نانا کو "غنڈہ" کہہ کہہ کے مُنہ چڑائے

عقیلہ:۔ تمہارا کُتّا کچن میں گھُس کے ہمارا سب دُودھ پی گیا ہے
جوانی بیٹے کو کیا کہوں میں ابھی ابھی کھا کے گھی گیا ہے،

شکیلہ:۔ میں جانتی ہوں کہ میرے کُتّے کو اِس پہ تُو نے بھی کیا سزا دی
زباں سنبھال اپنی ورنہ پھاڑ دوں گی میں تجھ کو حرامزادی

عقیلہ:۔ حرامزادی تو وہ تھی جس داشتہ نے تجھ کو جنم دیا تھا
کلال زادی تھی، مال زادی تھی جس نے رشتہ ترا لیا تھا

شکیلہ:۔ ترا حسیں باپ تیری اماں کو ناگ پور سے بھگا کے لایا
گیا جو پکڑا تو میرا سُسرا ہی کلموہے کو چھُڑا کے لایا

عقیلہ:۔ تمہارا سُسرا وہی جو بھیڑیں کبھی زمانے میں ہانکتا تھا!
ہماری اماں کو روز چھُپ چھُپ کے اپنی کھڑکی سے جھانکتا تھا

شکیلہ:۔ تمہارا شوہر بھی چھُپ کے کھڑکی سے روز نیاری کو جھانکتا ہے
وہ روز کھڑکی کے پاس ہی کیوں بٹن قمیصوں میں ٹانکتا ہے؟
رکھے ہیں کل ہی لکھے جو اُس نے وہ عشقیہ خط ہیں لوٹے گیارہ
دکھاؤں گی سب کو آج یہ خط پڑھے گا اِن کو محلہ سارا

عقیلہ:۔ اری بہن!...... آپا...... کیا یہ سچ ہے؟ میری خطائیں معاف کر دو
بہن بہن سے لڑی تو کیا ہے جو دل میں ہے میل صاف کر دو۔
میں کتنی باتیں سنا رہی تھی زبان خاموش تھی تمہاری
قسم خدا کی بتاؤں کیسے، ہو تم مجھے جان و دل سی پیاری

تُم اپنے گھر میں مجھے بُلانا میں چُھپ کے دیکھوں کی سب نظارہ

جو وہ اشارے کریں گے تُم کو ہوا کر دوں گی میں عشق سارہ

ابھی میں آتی ہوں میری پیاری رومال میں باندھ کر مٹھائی

ذرا مجھے بھی وہ خط پڑھانا کہ جن میں الفت گئی جتائی

تمہارا کتّا اِدھر جو آئے نہ روکو معصوم جانور ہے

وہاں جو کھائے یہاں بھی کھائے کہ یہ بھی آخر اسی کا گھر ہے

تمہارا بکرا ہمیں ہنساتا ہے گھر میں آ کے ہلا کے ڈاڑھی

میں پیار سے روک دوں گی اس کو اگر وہ میری اٹھائے ساڑھی

○

جلال زادہ

سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا جھُم جھُم دھاڑ خاں

تیرے رونے سے بہت تنگ آ گئی ہے تیری ماں

مت اکڑ، چُپکے سے سوجا، کالے کالے میرے لال
نوچ ڈالوں گی میں ورنہ تیرے لمبے لمبے بال

تُو ہے اِک ڈاکو کا بیٹا تو نہیں رو میری جان

سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا جھُم جھُم دھاڑ خاں

دیکھ تیرے سامنے دس من کا جو صندوق ہے

اُس کے پیچھے کارتوسوں سے بھری بندوق ہے

اِس سے آگے کیا کہوں؟ کھُلوا نہیں میری زباں

سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا جھُم جھُم دھاڑ خاں

ایک دن کا ذکر ہے روتی تھی میں سوتی نہ تھی
باپ تیرا چپ کراتا تھا میں چپ ہوتی نہ تھی
توڑ ڈالیں اُس نے اِک مکّے سے میری پسلیاں
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چھجّم دھاڑ خاں

جب گھروں میں کودتا ہے وُہ کسی دیوار سے
قفل کھل جاتے ہیں ڈر کر اُس کی اِک للکار سے
سہم کر ہر جیب یہ کہتی ہے "اجی میں ہوں یہاں!"
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چھجّم دھاڑ خاں

دست بستہ ہو کے موت اُس سے کہے آداب عرض
عالی جاہا آپ پورے کر رہے ہیں میرے فرض
آپ کو ٹوکوں بھلا یہ مجھ میں ہمت ہے کہاں"
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چھجّم دھاڑ خاں

بَن میں سب شیرِ ببر اُس سے کہیں بعد از سلام
حکم دیجے کس کو پھاڑیں آپ کے ادنیٰ غلام

آپ کے بچّے شہنشاہوں کی کر دیں بوٹیاں"
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چھجّم دھاڑ خاں

"پھو" کرے تو چاند کا دیپک بجھا سکتا ہے وُہ
"شو" کرے تو آگ ساگر میں لگا سکتا ہے وُہ
اُس کو غصّہ آئے تو اُلٹی بہا دے ندیاں
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چھجّم دھاڑ خاں

ہاتھیوں کے شوخ بچّے بن میں جب سوتے نہیں
اور ریں ریں کر کے جب روتے ہیں چپ ہوتے نہیں
سُن کے اُس کا نام کر دیتے ہیں بند اپنی فغاں
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چھجّم دھاڑ خاں

زیوروں کی بوریاں اونٹوں پہ لے کر آئے گا
آج نوٹوں سے لدے چھکڑے وہ گھر میں لائے گا
میں اکیلی جان اِتنے نوٹ رکھوں گی کہاں
سوجا ہیبت خاں کے پوتے سوجا چھجّم دھاڑ خاں

وہ اُٹھی آندھی وہ سہمے گھر کے سب دیوار و در
اُڑ گئے شاخوں سے کوّے شاید آتا ہے وہ گھر

پُونچھ لے جلدی سے آنسو گر ہے پیاری تجھ کو جاں
سو جا ہیبت خاں کے پوتے سو جا، جھجھم دھاڑ خاں

○

جمال زادہ

میرے ننھّے چاند مست رو میرے شاہزادے سو جا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا

تیرا باپ میرے گھر سے مجھے ورغلا کے لایا
ہوا وصل در جہنّم جو مجھے بھگا کے لایا

تھا جمالؔ نام اُس کا اسے جمال زادے سو جا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا

مجھے موہنے کو جس نے کیا روز مجھ سے دنگا
نہیں اب وہ آنے والا گیا بھاگ وہ لفنگا

جسے میں کبھی نہ بھولوں تو اُسے بھلا دے سو جا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا

وہ کواڑ بند کر کے مجھے روز پیٹتا تھا
کبھی مثلِ چارپائی وہ مجھے گھسیٹتا تھا

تو اگر ہے میرا بیٹا اُسے بد دُعا دے سوچا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سوچا

میری چُٹیا اُس نے کاٹی میری ٹانگ اُس نے توڑی
میرا کون ہے جہاں میں کہاں جاؤں میں نگوڑی

جو میں کر چکی ہوں اُس کی نہ مجھے سزا دے سوچا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سوچا

وُہ جو عاشقی کے دن تھے وہ کبھی کے کٹ چکے ہیں
میرے بِک چکے ہیں زیور میرے کپڑے پھٹ چکے ہیں

کہیں میری آہِ سوزاں نہ تجھے جلا دے سوچا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رُلا دے سوچا

نہ لبوں پہ اب ہے سُرخی نہ وہ منہ پہ اب ہے غازہ
لئے جا رہی ہے قسمت میرے عشق کا جنازہ

کہیں حادثہ یہ پاگل نہ مجھے بنا دے سوچا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رُلا دے سوچا

مجھے کون آسرا دے، میں ہوں شہر میں اکیلی
نہ مرا عزیز کوئی، نہ مری کوئی سہیلی

میرے غم کو میرے دُکھ کو تو ہی آسرا دے، سوچا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سوچا

ارے سو، نہیں تو دوں گی تیرے مُنہ پہ ایک تھپڑ
کہیں پھینک دوں گی باہر، تجھے مار کر دو ہنتڑ

اے سُوّر کے بچے مت رو، اے حرامزادے سوچا
تیری ضد کہیں اے ظالم، نہ مجھے رلا دے سوچا

○

چاچا رحیم اللہ

"مجھے روکا ہے کیوں؟ کیا بات ہے چاچا رحیم اللہ"

"اری یہ پوچھنا تھا آج کیسا ہے کریم اللہ؟"

"کریم اللہ تو کہتا تھا چچا سے مل کے آیا ہوں"

"اری اب بیٹھ بھی تا، آ اِدھر، کیا میں پرایا ہوں؟"

"چچا جانے دو، زیبو تاک میں ہر وقت رہتی ہے"

"بہت آتا ہے غصہ تو چچا کیوں مجھ کو کہتی ہے"

"جو کہنا ہے ذرا جلدی کہو، اب مجھ کو جانا ہے"

"تیرے ہونٹوں پہ ظالم ہر گھڑی کوئی بہانا ہے"

"او بی اللہ اُتر آئے ہو تم تو ہاتھا پائی پہ"

"او ظالم بیٹھ جا بس دو منٹ اِس چارپائی پہ"

"ارے چھوڑو کلائی تو یہ چوڑی ٹوٹ جائے گی"

"میرا منہ میٹھا کرتی جا۔ کلائی چھوٹ جائے گی"

"میں رو دوں گی مجھے چھوڑ دو، بچی کو جا کے پکڑو نا"

"بچی چولھے میں جائے، پیاری بلّو مجھ سے اکڑو نا"

"ارے میں مر گئی توبہ چچی وہ آ گئی چھوڑو"

"گئی ہرنی میاں اب بیٹھ کر تم اپنا دل جوڑو"

انہیں راہوں میں بیٹھا روز حقّہ گڑگڑاتا ہوں
سوا اُس کے تصور کے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں

○

میرے تکیوں پر لکھے ہوئے اشعار

یہ آرزو ہے کہ سویا رہوں ہزاروں سال
قیامت آئے تو بیگم مجھے جگا دینا

○

کھا نہ ہمسائی سے میری چٹکیاں جانِ بہار
میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں، مگر سویا نہیں

○

تکیے پہ شب کو پانی چھڑک کر میں سو گیا
وہ سمجھیں ان کے ہجر میں رویا تمام رات

پانچ چھ تکیوں کو پھیلا کر اڑھا دو اک لحاف
بھاگ جاؤ۔ بیویاں سمجھیں گی شوہر گھر میں ہے

○

کوشش کروں ہزار، نہ آئے گی مجھ کو نیند
تکیہ ہے نرم۔ بیوی کا برتاؤ سخت ہے

○

خدایا کون یہ تکیے پہ میرے لکھ گیا آکر
"ترا سر رنج بالیں ہے۔ تیرا تن بار بستر ہے"

○

ہمیں ہماری بیویوں سے بچاؤ

یہ پل پڑتی ہیں ہم پر، جب بھی ہم دفتر سے آتے ہیں
ہلاکو خاں سے یا چنگیز خاں سے اِن کے ناتے ہیں

نہ اُٹھ کر پنکھا جھلتی ہیں، نہ دیتی ہیں ہمیں پانی
پسینہ اپنا ہم تو ٹھنڈی آہوں سے سُکھاتے ہیں

اِنہیں لازم ہے جب ہم آئیں یہ جھک کر قدم چھُو لیں
مجازی ہم خدا ہیں پھر بھی ان پر رحم کھاتے ہیں

اُڑا لیتی ہیں سب نقدی تلاشی جیب کی لے کر
ہم اپنی ہی کمائی اِن سے ڈر ڈر کے چھپاتے ہیں

کچھ انکم ٹیکس لے جاتا ہے، کچھ بیوی اُڑاتی ہے
قسم اللہ کی شوہر بہت دولت کماتے ہیں

سہیلی اِن کی آجائے تو سمجھو عید ہے اِن کی
بگڑ جاتی ہیں، جب ہم دوستوں کو گھر بُلاتے ہیں

نہیں جاتیں کبھی باورچی خانے میں یہ بھُولے سے
کماتا ہے بہت آقا، مزے نوکر اُڑاتے ہیں

بہانہ کر کے دردِ سر کا اکثر لیٹ جاتی ہیں
نہ ہو نوکر اگر گھر میں، تو ہم چائے بناتے ہیں

ہے اِن کا کام رونا، پان کھانا یا بگڑ جانا
کریں کیا با دلِ ناخواستہ اِن کو مناتے ہیں

خدایا آج کے شوہر ہیں یا معصوم بچّے ہیں
ذرا سا گھُور لے بیوی، تو جھٹ یہ سہم جاتے ہیں

یہ جب روتی ہیں ہم اپنے کلیجے تھام لیتے ہیں
سیاہی چوس لے کر اِن کے آنسو ہم سکھاتے ہیں

حجامت روز کر دیتی ہیں یہ غصّے کی قینچی سے
غنیمت ہے کہ اپنی شیو تو ہم خود بناتے ہیں

اذاں جب مرغ دیتا ہے' سمجھتی ہیں یہ لوری ہے
انہیں مرغے سُلاتے ہیں' ہمیں مرغے جگاتے ہیں
چلے جاتے ہیں کھا کر رُوکھی سُوکھی اپنے دفتر کو
بچارے مرد سب رو رو کے اپنے دن بتاتے ہیں
بروزِ حشر جیسے بھی ہیں شوہر بخشے جائیں گے
سدا جو بیویوں کے ظُلم سہہ کر مسکراتے ہیں
کبھی آزاد تھے ہم ہائے اِس قیدِ غلامی سے
وہ دِن کتنے تھے اچھے' ہائے وُہ دن یاد آتے ہیں

دستکِ نیم شب

کھٹ کھٹاتا ہُوں بہت دیر سے دروازہ کھول
اے مری رُوٹھی ہوئی بیوی ذرا منہ سے بول

رات کو دیر سے آنا مری عادت ہی سہی
میرا ہر عیب چھپانا تیری فطرت ہی سہی
میری راحت کیلئے تھوڑی سی زحمت ہی سہی
حرفِ اُلفت نہ سہی حرفِ ملامت ہی سہی

شیریں آواز کا کانوں میں میرے سہاب رس گھول
کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

شک نہ کر مجھ پہ مری جان سے پیاری ممتاز
پڑھ رہا تھا کسی مسجد میں تہجّد کی نماز

ایک ہی صف میں کھڑے تھے وہاں محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بندہ نواز

میرے ہی گھر سے نہ کر ہائے میرا بستر گول
کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

پھول اِک روز ترے پیار کے توڑے میں نے
کھائے والد سے ترے عشق میں کوڑے میں نے
مرمریں ہاتھ ترے پھر بھی نہ چھوڑے میں نے
بحرِ سسرال میں دوڑا دیے گھوڑے میں نے
اپنے ماضی کی ترازو میں ذرا مجھ کو تول
کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

"عشرتِ بیوی ہے شوہر میں فنا ہو جانا"
نہ کہ ہر بات میں شوہر سے خفا ہو جانا
یک بیک رحم و مروت کا ہوا ہو جانا
باور آیا ہمیں بیوی کا خدا ہو جانا

پر خدا کو بھی نہیں بندوں پہ اتنا کنٹرول
کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

تجھ کو میری ہی قسم ختم کر اب تو یہ سوانگ
رات کو کھیل نہ غصّے کی یہ پیاری پینگ پانگ
اُونچی دیوار سے کُودا تو سرک جائے گی ٹانگ
مجھ سے پہلی سی محبت میری ممتاز نہ مانگ
اور بھی فکر ہیں بیوی کی محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں بیوی کی راحت کے سوا
کیسے کر سکتا ہوں دن رات میں مجنوں کا رول
کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

"آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک"
کھٹ کھٹاتا ہی رہوں گا میں سحر ہونے تک
"دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک"
میں بھی جیتا ہوں محلے کو خبر ہونے تک

آج اُتر جائے گا شاید میری عزت کا خول
کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

اچھا جاتا ہوں مجھے دل سے بھلا دینا تم
یاد کبھی آؤں تو دو اشک بہا لینا تم
میری تصویر کو سینے سے لگا لینا تم
ختم راشن ہو تو بنیے سے منگا لینا تم

آج نادم ہوں کہ کیوں تم سے پڑھائے دو بول
اب نہیں تم سے کہوں گا کبھی "دروازہ کھول"۔

مثنوی قہرِ عشق

(۱)

ایک لڑکا "لڑکیاں" اپنی سدا
گاؤں کے باہر "نچایا" کرتا تھا

ایک دن سوجھی شرارت یہ اُسے
ایک لڑکی سے محبت وہ کرے

چڑھ کے اِک ٹیلے پہ چلانے لگا
"عشق آیا عشق آیا دوڑنا!"

گاؤں والے سُن کے یہ گھبرا گئے
اُس بچارے کی مدد کو آگئے

سب نے شادی اسکی کردی ایک سے
مل گیا وہ اُن میں سب سے نیک سے

شہر میں ساتھ اپنے اُس کو لے گیا
گاؤں کو داغِ جدائی دے گیا

وہ تھی موجِ حسن یہ موجِ شباب
چینی کی گڑیا دیا اُس کو خطاب

مست تھے وہ سب دلہن کی چاہ میں
سب کے سب آنکھیں بچھاتے راہ میں

رات دن دُولہا نے دی جب دادِ عشق
ایک دن پیدا ہوئی اولادِ عشق

عظمت اللہ خاں رکھا نبچے" کا نام

ماں کی گودی میں تھا بچہ شادکام

(۲)

وہ تھا دولہا اور دلہن تھی یہ کنیز — پتلی پتلی شوخ کومل اور دبیز

کچھ زمانہ خوب خوشیوں میں کٹا — ٹانگ ہی ٹوٹی نہ میرا سر پھٹا

آخرش بیندی سے وہ اُکتا گئے — میرے گردش میں ستارے آ گئے

روز مجھ پہ سختیاں ہونے لگیں — سُرمگیں آنکھیں میری رونے لگیں

چینی کی گڑیا وہ ڈائن بن گئی — آم کی ڈالی بکائن بن گئی

آج ہنگامہ سا گھر میں ہو گیا — جاگ کر میرا نصیبہ سو گیا

رکھ کے سب شرم و حیا بالائے طاق

آج اِس بندی نے لی ہے طلاق

(۳)

صبح یہ کتنی عظیم الشان تھی — چھ تھے وہ اور میں اکیلی جان تھی

تڑکے تڑکے جب چھڑا گھر میں فساد — میں بھی بولی دل میں "ہر چہ بادہ باد"

میری نندوں نے مجھے رنڈی کہا — دیوروں نے مجھ کو پگڈنڈی کہا

جیٹھ جب بولے کہ تو کتے کی دُم — میں نچا کر ہاتھ بولی "ہو گے تم!"

ساس کے زیرِ زنخداں تھی چھڑی — نرگس آسا تھی وہ آنگن میں کھڑی

گھور کر اُس نے کہا مجھ سے کہ "ہائیں؟" — ٹھیر جا لیتی ہوں میں تیری بلائیں

پہلے آ لپٹی وہ آتش کی طرح — بعد میں برسی وہ بارش کی طرح

گالیوں کی ہر طرف "بوچھاڑ" تھی — اِک ذرا گھونگھٹ کی تھوڑی آڑ تھی

دستِ شفقت مجھ پہ جب پڑنے لگے — ٹپ ٹپ آنسو آنکھ سے گرنے لگے

جب میرے مارے کے بتے تھک گئی — کولہے مٹکاتی وہ بیٹھک تک گئی

ہانپ کر بولی کہ بیٹا المدد!

لے کے ڈنڈا آ گئے عبدالصمد!

مجھ پہ وہ ڈنڈا پھرا پھر اس طرح — کاغذی لکڑی پہ رندا جس طرح

میری چیخوں کی بجیں شہنائیاں — کھڑکیوں میں آ گئیں ہمسائیاں

سب مجاہدانہ میں کچھ ایسے ڈٹے — چوڑیاں ٹوٹیں مرے کپڑے پھٹے

تھام کر بانہ گھماتے وہ رہے — جسم کی پھرکی پھراتے وہ رہے

میں نگوڑی ہوگئی جب ادھ موئی — فرش پر غش کھا کے اک دم گر پڑی

ہوگئے "وہ" چارپائی پہ دراز — گاڑ دی بندی پہ چشمِ نیم باز

مُنہ میں اپنے ٹھونس کر حقّے کی نے — کش لگائے چند اُنھوں نے پے بہ پے

بولے مجھ سے اور بھی کچھ بیجیۓ؟ — بس یہ بولی "ہاں وہ پرزہ" دیجیۓ

جھٹ اُنھوں نے ہاتھ میں دیدی طلاق

"عظمت اللہ"؟ بولے "ہاں ہاں وہ بھی عاق

(۵)

عارضوں پہ تھپڑوں کی لالیاں — منہ میں لاکھوں مل رہی ہیں گالیاں

گھر سے دروازے پہ بندی ہے کھڑی — اور کٹی چُٹیا ہے آنگن میں پڑی

ٹھنڈا پانی پی کے کچھ تھم اس کا — آخری بوسہ لیا ہے ساس کا

تانگہ یا ٹم ٹم ابھی منگواؤں گی — خیر سے میکے چلی اب جاؤں گی

ساتھ میرے عظمت اللہ خان ہے

لب پہ کُلُّ مَن علیہا فان ہے

ڈرامہ شیریں فرہاد

فرہاد:۔ مرے دل کی دھڑکن مری شاہزادی

مری آرزوؤں نے تجھ کو صدا دی

لباسِ حسیں تیرا یوں جگمگائے

چمک دیکھ اس کی قمر سہم جائے

گلستاں میں بلبل ترے گیت گائے

کلی تیرے لب کا تبسّم چرالے

ترے عشق نے آگ مجھ کو لگا دی

مری آرزوؤں نے تجھ کو صدا دی

شیریں:۔ یہ جی چاہتا ہے کہ اب مُسکرا کے

پٹخ دوں یہ ہیرے یہ موتی اٹھا کے

میں دِل میں چراغِ محبت جلا کے
رہوں گی ترے ساتھ کُٹیا میں آ کے
اگرچہ ہوں محلوں میں رہنے کی عادی
مری آرزوؤں نے تجھ کو صدا دی

ایکسٹرا سپلائیر:- ری ہرسل ہوئی ختم سینہ فگارو!
یہ ہیرے یہ موتی یہ کپڑے اتارو
وہی پھر غریبی وہی نامرادی!

شیریں:- مرے آگے اُلفت کا دامن نہ پھیلا
ری ہرسل ہوئی ختم چل میرے چھیلا
پہن گندے موزے، اُٹھا کوٹ میلا
یہ لے اپنی بیڑی یہ لے اپنا تھیلا
پٹخ دے یہ مخمل پہن لے یہ کھادی

ایکسٹرا سپلائیر:- یہ فی الحال تم دو روپے لے کے جاؤ
رسید اِس رقم کی ابھی دے کے جاؤ

بہت چارسو بیس کے تم ہو عادی!

شیریں:- چلو دو روپے لے کے اب مسکرائیں
فرہاد:- بہت دِل سے بھوکے ہیں راشن منگائیں
شیریں:- جو ٹھنڈے پڑے ہیں وہ چولھے جلائیں
فرہاد:- "محبت کے یہ گیت" چولھوں میں جائیں
کہ فاقوں نے بنیادِ اُلفت ہلا دی

پھر ہم نے لیں آنکھیں کھول

مانگے کی کتابیں ـــــ واپسی پر

"کلامِ حالیؔ" پہ گھی کی تھالی رکھی رہی تھی، معاف کیجئے
پھر اِس پہ اِک دن دوات میری اُلٹ گئی تھی، معاف کیجئے

"کلامِ داغ" آہ کتھے چونے کے پیالے داغوں سے بھر گیا ہے
اور اِس میں سے اِک حسین غزل میں نے پھاڑ لی تھی، معاف کیجئے

"کلامِ غالبؔ" پہ غالب آئی تھی میرے بچوں کی بدتمیزی
ورق ورق ہو کے ہر غزل اُن میں بٹ گئی تھی، معاف کیجئے

"کلامِ آزادؔ" جلد سے اپنی آج آزاد ہو گیا ہے
کہ اس پہ نندوں میں چھینا جھپٹی سی ہو گئی تھی، معاف کیجئے

"کلامِ آتش" باورچی خانے میں لے گئی تھی میری پڑوسن
سرِ ورق پہ حساب بنیے کا لکھ گئی تھی، معاف کیجئے

"فسانہ میں پہ ذرا کھیر گر گئی تھی، نہ آہیں بھریئے
وہ کھیر جھٹ میں نے اپنے دامن سے پونچھ دی تھی، معاف کیجئے

"انیس کے مرثیوں" پہ آنسو میرے گرے تو ورق پسیجے
لگا کے آنکھوں سے اِن کو شاید میں رو پڑی تھی، معاف کیجئے

وہ "بالِ جبریل" کھو گئی ہے، گئے ہیں شاید اُسے فرشتے
سنبھال کے ورنہ طاقِ نسیاں میں یہ رکھی تھی، معاف کیجئے

"کلامِ اکبر" کو میرے اصغر نے چار آنے میں بیچ ڈالا
زیادہ پیسے نہیں ملے چونکہ پھٹ گئی تھی، معاف کیجئے

وہ "شعلہ و شبنم" ایک مزدور مجھ سے یہ کہہ کے لے گیا تھا
کہ جوشؔ نے یہ کتاب میرے لئے لکھی تھی، معاف کیجئے"

"بہارِ اختر" کو میرا اختر نہ پھینک آیا ہو وادیوں میں
کتاب یہ اُس نے ننھی سلمیٰ سے چھین لی تھی، معاف کیجئے

وہ "نقشِ فریادی" رُوس چل دی کہ رُوس اُس کو پسند آیا
ہمارے گھر میں بہت ترقی نہ کر سکی تھی، معاف کیجئے

• کتابِ راشدؔ تو قافیوں کی تلاش میں آج گھر سے چل دی
میں کیا کہوں، یہ بہت ہی آزاد ہو گئی تھی، معاف کیجے

• کلامِ چرکینؔ پہ ایک دھبہ نہیں لگایا ہے دیکھ لیجے
کتاب یہ آج ہم نے کر کے وضو پڑھی تھی، معاف کیجے

• بہت حفاظت سے لائی ہوں یہ کتابیں اپنی سنبھال لیجے
میں پڑھ چکی "نظم" نثر الماریوں سے مجھ کو نکال دیجے

○

دو حرام زادے

پہلا شرابی:- زمانہ گردش میں جھومتا ہے نشے نگاہوں کو آ رہے ہیں
وہ ہاتھ زندہ رہیں خدایا جو مجھ کو وِسکی پلا رہے ہیں

دوسرا شرابی:- جناب کیا آپ ہوش میں ہیں؟ اگر ہے ایسا تو اور لیجے
شراب خانے میں آئے ہیں تو خودی کو غرقِ شراب کیجے

پہلا شرابی:- نشہ بہت ہو گیا ہے صاحب نہ اور دیجے شراب مجھ کو
کہ اِک بڑا سانپ لگ رہا ہے یہ لمبا لمبا کباب مجھ کو

دوسرا شرابی:- کباب تو بہترین ملتے ہیں شام کو میرے گھر کے آگے
اور اِتنے خستہ کہ ٹوٹ جائیں اگر نہ بیٹھے ہوں ان پہ دھاگے

پہلا شرابی:- پتہ جناب اپنے گھر کا اِس خاکسار کو بھی بتایئے گا
یہ کارڈ میرا ہے بھائی صاحب ! ضرور تشریف لایئے گا

پہلا شرابی:- اٹھارہ نمبر، نظام منزل، یہ میرے گھر کا پتہ ہے صاحب!

دوسرا شرابی:- منگا دوں ٹیکسی؟ بہت نشہ آپ کو آگیا ہو گیا ہے صاحب!

پہلا شرابی:- نشے میں کوئی بھی اپنے گھر کا پتہ نہیں بھولتا ہے مسٹر

دوسرا شرابی:- بہت سی پی لے تو ماں بہن تک کو بالیقیں بھولتا ہے مسٹر

پہلا شرابی:- میرے کرم! یقین کر لو۔ بہک گئے ہو نشے میں گم ہو

دوسرا شرابی:- تو گویا طلعت کے نام پر جو مکاں ہے اُسکے مکین تم ہو

پہلا شرابی:- قسم خدا کی اٹھارہ نمبر، نظام منزل، مرا مکاں ہے

دوسرا شرابی:- کرایہ دیتی ہے اِس کا طلعت تو کہہ رہا ہے ترا مکاں ہے

پہلا شرابی:- نشے میں کہتا ہوں صاف تجھ سے بہت ہے طلعت کو پیار مجھ کو

دوسرا شرابی:- زباں کو دے لگام ورنہ تو آج کھائے گا مار مجھ سے

پہلا شرابی:- جو ہاتھ مجھ پر کبھی اٹھایا طلاق لے لے گی تجھ سے طلعت

دوسرا شرابی:- وہ تجھ کو سینڈل سے پیٹ دے گی کہ عشق کرتی ہے مجھ سے طلعت

پہلا شرابی:- اگر تجھی سے وہ عشق کرتی، گلے لگاتی نہ وہ مجھے بھی

دوسرا شرابی:- ابھی جہنم میں بھیجتا ہوں تیرے نشے کو بھی اور تجھے بھی

پہلا شرابی:- گلا پکڑ مت! ہٹا لے اپنے یہ ہاتھ گندے، یہ کالے کالے

دوسرا شرابی:- تباہ کر دوں گا۔ مار ڈالوں گا میں نہ چھوڑوں گا تجھ کو سالے

پہلا شرابی:- اٹھارہ نمبر نظام منزل میں بول بیٹا کبھی گھسے گا؟

دوسرا شرابی:- تمہاری ماں کو گلے لگانے تمہارا یہ باپ ابھی گھسے گا

پہلا شرابی:- کمینے کتے (پھٹے گریباں) رذیل پاجی (پھٹی وہ ٹائی)

دوسرا شرابی:- سُور کے بچے (گلاس ٹوٹے) حرام زادے! (گری تپائی)

شڑاپ تھپڑ، کھٹاک گھونسے دھڑم بھڑم دھاپ چل رہے ہیں
گلے پھلا کے دُمیں اُٹھا کے یہ دونوں مرغے اُچھل رہے ہیں

تیسرا شرابی:- حسیں ہے موسم، سماں ہے رنگیں، لڑو نہیں بھائی باز آؤ
ارے او بیرا یہ کیا ہے گڑبڑ؟ یہ مر نہ جائیں اِنہیں چھڑاؤ

بیرا:- جناب یہ دونوں باپ بیٹے ہیں، بھول جاتے ہیں روز پی کے
یہ دونوں رہتے ہیں ایک ہی گھر میں غُل مچاتے ہیں روز پی کے

تیسرا شرابی:- اجی وہ طلعت کا کیا ہے قصہ؟ جو ہو گئی زیبِ داستاں ہے

بیرا:- اجی وہ ہے ایک نیک عورت جو "اِس" کی بیوی اور "اُس" کی ماں ہے

بورڈ آف انٹرویو

کُتا کیوں اپنی دم دباتا ہے؟
کتنے میں ایک بندر آتا ہے؟
آسماں پہ ستارے کتنے ہیں؟
شہر میں غم کے مارے کتنے ہیں؟
تھوبڑی پور میں کتنے مالی ہیں؟
شہر میں کَے مکان خالی ہیں؟
آج کیا بھاؤ ہے بتاشے کا؟
کیٹس کا وزن کتنے ماشے تھا؟
لانگ فیلو کی کتنی ٹانگیں تھیں؟
صبح مرغے نے کتنی بانگیں دیں؟

اُردو ناول میں کیا جھکاؤ ہے؟
کیوں نئی شاعری میں تاؤ ہے؟
شاعری کے ہیں کتنے امکانات؟
اِس پہ قلیوں کے کیا ہیں احسانات؟
ذوقؔ کتنے روپے کماتا تھا؟
اپنی بیوی سے کیوں چھُپاتا تھا؟
مرزا غالبؔ کے کتنے بچے تھے؟
کتنے جھوٹے تھے، کتنے سچے تھے؟
آ کے محمود سترہ حملوں میں؟
کون شے لے گیا تھا گملوں میں؟
کچھ کہو آلوؤں کے بارے میں
کچھ کہو بھالوؤں کے بارے میں
کیوں ہمیں دیکھ کر ہو تم گُم سُم؟
اُلّوؤں سے کبھی ملے ہو تم؟

مُریدانِ باصفا

(۱)

یہاں سے "پیر صاحب" اب نہ جانا
خدارا یہ ستم ہم پر نہ ڈھانا

مسلماں تُم ہو ہم بے دین کافر
تمہیں اوّل ہمارے تُم ہی آخر

بہت ہی دُور ہیں اِسلام سے ہم
نہیں مانوس ابھی اِس نام سے ہم

سمجھ لو کافروں کی ہے یہ بستی
یہاں تم سی نہیں ہے کوئی ہستی

تلاشِ پیر میں غمگین تھے ہم
بہت مُلحد، بہت بے دین تھے ہم

بہت سے راستے تم نے دکھائے
بہت پتّھر تھے رستے سے ہٹائے

یہاں اب اِک بڑی مسجد بنانا
نمازیں رات دن ہم کو پڑھانا

نہ جانا بھاگ ہم سے تنگ آ کے
تمہیں پالیں گے ہم دنبے کھلا کے

پلائیں گے تمہیں ہر صبح بادام
کھلائیں گے تمہیں اخروٹ ہر شام

تمہیں ہم دیں گے لمبے لمبے چاقو
پلائیں گے تمہیں کڑوا تمباکو

پچھتّر سے کے دم تمہیں لگوائیں گے ہم
کبھی تُم سے تمہیں اُکتائیں گے ہم

نہیں اب دیوی بچوں کو کرو یاد
سبھی فکروں سے اب ہو جاؤ آزاد

کہو تو آج بیڑا پار کر دیں
تمہاری شادیاں ہم چار کر دیں

بہت ہو تم اگر بچوں کے شیدا
یہاں بھی تو وہ ہو سکتے ہیں پیدا

(۲)

بہت عرصے سے تم گھبرا رہے تھے
وطن کو چوری چوری جا رہے تھے

پکڑ کر مار ڈالا آج ہم نے
شہادت کا پہنایا تاج ہم نے

کئے ہم نے تمہارے پانچ ٹکڑے
تمہارے کر دئے سب دور دکھڑے

ابھی تم کو کفن پہنائیں گے ہم
بہت روئیں گے جب دفنائیں گے ہم

دلوں میں ہوک لب پہ آہ ہوگی
تمہاری اک حسیں درگاہ ہوگی

سرہانے اک دیا جلتا رہے گا
درود اور فاتحہ چلتا رہے گا

کریں گے ہم تمہارا عرس ہر سال
مریدوں کو وہاں پر آئے گا حال

سب آئیں گے تمہاری لے کے یادیں
ملیں گی تم سے ہم سب کو مرادیں

یہ چہرہ اور یہ ریشِ پُر انوار
دکھائی دے رہے ہیں آخری بار

چلو اب پیر کو گودی میں لے لو
لحد کی گود میں اس کو دھکیلو

کسی کا خاک میں ملنا جوانی دیکھتے جاؤ
بہا کے اشک اِس کی لاشِ فانی دیکھتے جاؤ
بہت یہ وعظ کرتا تھا مگر یہ اب نہ بولے گا
کفن سر کا وہ اس کا بے زبانی دیکھتے جاؤ

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی گر نہ دیکھا ہو
مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

○

سُؤروں کی بغاوت

(١)

جاؤ یہ اعلان کر دو آج باجے بینڈ سے
اپنے بستر گول ہم کر لیں گے کل انگلینڈ سے
بچہ بچہ بُڈھا بوڑھا دُشمنِ جاں ہے یہاں
ہم وہاں آباد ہیں ہر سمت ہیں مُوذی جہاں
پالتے ہیں موٹا کرتے ہیں ۔ بہت کرتے ہیں پیار
پھیرتے ہیں دستِ شفقت ہم پہ آکر بار بار
بوسے لیتے ہیں ۔ ہمیں صابن سے نہلاتے ہیں یہ
بعد میں اِک دن پکا کر ہم کو کھا جاتے ہیں یہ

ہم نے صدیوں ہی سہی ہیں سختیاں انگریز کی
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے ہم زینت بنے ہر میز کی
کانٹوں اور چھریوں سے ہم کو منہ میں لے جاتے رہے
ہم کو کھا کھا کر یہ اپنا راج پھیلاتے رہے
کریم بن کر ان کی ہر عورت کے گالوں میں ہیں ہم
برش بن بن کر پھرے ہر مرد کے بالوں میں ہم
اپنی دم کے بال لے کر شیو یہ کرتے رہے
اپنی دُم تک سے بھی مس بی ہیو یہ کرتے رہے
برش دانتوں کا بنا کر منہ میں لے جاتے ہیں یہ
اور جانے اب کہاں تک ہم کو پہنچاتے ہیں یہ
اس قدر ان کی طبیعت ہم پہ مائل ہو گئی
اپنی چربی اُن کی چربی تک میں شامل ہو گئی
چھپ کے ہر اِک چیز میں چپکے سے گھس جاتے ہیں ہم
اُن کے ہر "شعبے" میں ہر "مال" میں نظر آتے ہیں ہم

اِک طرف دشمن خدا ہے اِک طرف انگریز ہے
ہم سے دونوں کا رویہ اشتعال انگیز ہے
ایک پل مت سوئیو اب ایک پل مت لیٹیو
باندھ لو رختِ سفر اے ماؤ، بہنو، بیٹیو!
آؤ ہم اُس دیس کو چل دیں مسلماں ہوں جہاں
آؤ اب اس قوم کے جا کر بنیں ہم میہماں
رہیے واں جا کر جہاں میلوں تک عیسائی نہ ہو
جان دینے کی مصیبت قوم پر آئی نہ ہو،

(۲)

دو برس سے جنگلوں میں پھر رہے ہیں ہم اُداس
کیا کریں کوئی پھٹکتا تک نہیں ہے اپنے پاس
دُور سے آتی ہے کانوں میں صدائے "آخ تھو"
خوب روتے ہیں کلیجہ تھام کر "میں اور تو"

ملک اپنا چھوڑنے کا آج یہ ریزلٹ ہے
ہر طرف ذلت ہے اپنی ہر طرف انسلٹ ہے
اِس قدر توہین اپنی قوم کی ہوگی کہاں
ہم یہ سنتے ہیں "سؤر کا بچہ" گالی ہے یہاں
وہ جو میخانوں میں چھپ چھپ کر چڑھاتے ہیں شراب
مے تو پی لیتے ہیں وہ کھاتے نہیں اپنے کباب
ہم غریبوں کو بھی وہ تھوڑا سا چکھ کر دیکھتے
ایک ٹکڑہ ہیم کا منہ میں تو رکھ کر دیکھتے،
گر شرابی لوگ کھا لیتے کبھی اپنے کباب
ہے یقیں ہم کو وہ نالی میں بہا دیتے شراب
اے خدا آخر بتا کس کام کے ہیں ہم غریب؟
سامنے ہیں ہم مگر کھاتے نہیں یہ بدنصیب
رحم کھاؤ ہم پہ بابا - ہم نہیں اِتنے بُرے
یہ سرِ تسلیم خم ہے آؤ لے کر چھُرے

یہ نہیں آئیں گے۔ کہہ دو آج باجے بینڈ سے
"ہم بہت پچھتا رہے ہیں آئے کیوں انگلینڈ سے"
اس سے تو اچھا ہے۔ ہم سب موت عزت کی مریں
چھوڑ دیں یہ مُلک اور انگلینڈ ہم واپس چلیں
ایک پل مت سوئیو، اب ایک پل مت لیٹیو
باندھ لو رختِ سفر اے ماؤ، بہنو، بیٹیو!
جب وہاں جائیں گے ہم کو ہار پہنائیں گے وہ
کاٹ ہی دیں گے تو ہم کو پیار سے کھائیں گے وہ
رہیے کیوں اُس جا جہاں بیلوں تک عیسائی نہ ہو
بن کے دُلہن گھر میں کوئی میم تک آئی نہ ہو"

○

مثنوی تاج دین معراج دین

(۱)

میں لکھنے سے پہلے یہ کرتا ہوں طے
یہ اُنیس سو تیس کا ذکر ہے

یہاں سے میں پہنچا ہوں لاہور میں
سمجھ لیجیے انگریز کے دور میں

میں ہوں اور پنجاب کے زندہ دل
وہ رخشندہ چہرے وہ تابندہ دل

وہ گھر سے نکل آیا بازار میں
سمجھ لیجیے کوٹ اور شلوار میں

کروں اُن نظاروں کو اب میں بیاں
جو اُس دور میں میں نے دیکھے یہاں

(۲)

خوشی ہی خوشی ہے جدھر دیکھیے
ذرا مسکرا کر ادھر دیکھیے

وہ سڑکوں پہ "پنجابی منڈے" چلے
کسی نے کہا دیکھو غنڈے چلے

جھکی ایسی پگڑی ہے اک آنکھ پر
پڑے گر کسی پہ تو ترچھی نظر

یہ تہبند پہ بوسکی کی قمیص
جو دیکھے تو غش کھائے دل کا مریض

یہ دیں اس طرح اپنی مونچھوں پہ تاؤ
کہ رستم بھی الجھے تو بولیں کہ "آؤ!"

اکڑ کر چلے کیوں نہ ھر نوجواں
ہے قینچی کا سگرٹ بنوکِ زباں
بڑے فخر سے کش لگاتے چلے
دُھوئیں پہ دُھواں یہ اُڑاتے چلے

ادا کہہ رہی ہے کہ ہم شیر ہیں
ہر اِک سامنے اپنے بکری کی مَیں
طبیعت کے فطرت کے رنگین ہیں
یہ "کاچو" چلانے کے شوقین ہیں

نہیں کوئی غم خوش رہیں یہ مدام
فساد اور دنگے کریں صبح و شام
جسے چاہیں رستے میں کندھا لگائیں
وہ "چوں" بھی کرے تو اُلجھ اُس سے جائیں
کہیں کیوں بے گالی کسے تُو نے دی؟
نکالوں ابھی تیری "فوں" اور "فی"؟

یہ منٹوں میں بس دُھن کے رکھ دیں اُسے
ہزاروں میں یہ چُن کے رکھ دیں اُسے
یہ سمجھو نہیں پھر بچارے کی خیر
قیامت تلک اُس سے رکھیں گے بیر

ہیں مشہور ان کے لب "خوش کلام"
کریں لوگ ڈر ڈر کے اِن کو سلام
ادب سے کہے جو اِنہیں "پہلوان"!
رہے عزت اُس کی بچے اُسکی جان

یہ بھرپور سینہ یہ اُٹھتا شباب
کہیں کھائینگے جا کے نان اور کباب
"کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے"
نہیں چومتے اِن کے لب جام کو
کہ پیتے ہیں فالودہ یہ شام کو

گھدے بازوؤں پہ ہیں یاروں کے نام
ہر اک ان میں ہے عاشقی کا امام
بہت اونچا عورت کا سمجھیں مقام
یہ کرتے ہیں اِس صنف کا احترام
یہ ہیں تاج و معراج و مہتاب علی
اکھاڑوں میں ان کی جوانی پلی
پیا اِن کے جسموں نے سرسوں کا تیل
چڑھی اِن کے قد پہ جوانی کی بیل
بنے جسم فولاد ڈنٹر پیل کر
گزاریں یہ ہر شام ٹینس کھیل کر
نہ دل ہیں یہ لائیں غم خوب و زشت
یہ دُنیا ہی اِن کے لئے ہے بہشت
بظاہر تو برطانیہ کا ہے راج
مگر اصل میں ان کے سر پہ ہے تاج

○

اشنان

پیپل کے اِک پیڑ کے نیچے
منگا میلے کپڑے رکھ کے
اپنی ناک چھنکتا آیا
اور پھر گنگا جل میں نہایا
گندے مُنہ سے اُگل کے منتر
کرنے لگا وہ جسم پوِتّر
پاپ اپنے جب دھو گیا منگا
پھر کر آہ یہ بولی گنگا
یہ کیا کر دیا تُو نے آ کر—؟
اب میں کہاں نہاؤں جا کر؟

کُلاہ پوش

ویران تھا صحرا   خاموش تھا دریا
دریا کے کنارے   سردی سے ٹھٹھرتا
اک اوڑھ کے ٹوپی   چُپ چاپ تھا بیٹھا
کُرسی کی لئے ٹیک

کالا سا پہاڑ ایک

بُہت بڑا آنسو

کِس کی آنکھوں سے گرا ہے؟
یہ سمندر! —— یہ بڑا سا آنسو!

آسماں کا بُلبُلہ

اِس پہ بہت ہنستا ہوں میں
میرے خدا سُن تو ذرا
یہ آسماں کا بُلبُلہ
کیوں تُو نے ہم پہ رکھ دیا؟

ایک چہلم

(۱)

جمیلہ اب اُٹھو نہ آنسو بہاؤ　　نہیں وقت رونے کا دریاں بچھاؤ
یہ دُنیا ہے فانی، گیا جانے والا　　وہ رونے سے واپس نہیں آنے والا
نہ بیکار اب تم دُہائی مچاؤ　　اُٹھو سارے گھر میں صفائی کراؤ
تو کر صاف کمروں کے جالے ذکیہ　　تو چھت سے بڑا بانس اُٹھا لا رضیہ
چھپا کر کہیں رکھ دے میلی رضائی　　بنائے گی باتیں شفاعت کی تائی
کریں صاف مل جل کے آنگن کو آؤ　　خدا کے لیے ناک گھر کی بچاؤ
ذکیہ کی ماں تیج بستر منگانا　　کریم دین کو دے کے سائیکل بھگانا
مچائی ہے باورچیوں نے دُہائی　　نہیں گوشت لایا مجید و قصائی
ورق یہ ہیں نقلی یہ چاول ہیں گھٹیا　　اِنہیں جلد واپس کرا اُلّو کی پٹھیا

معزز معزز جو آئیں گے مہماں　　بہت ناک اور بھوں چڑھائیں گے اماں
خدا کے لیے جلد حُقّے منگاؤ　　میاں بھاگ کر چائے پلٹن کی لاؤ
جو مرد آکے اظہارِ ماتم کریں گے　　وہ بیٹھک میں رہیں گے چائے پئیں گے
وہ حُقّے ابھی گڑگڑائیں گے آکر　　وہ آہیں فلک پر اُڑائیں گے آکر
سنائیں گے "مرحوم" کے وہ فسانے
کہ لب بولنے کو دیے ہیں خدا نے

(۲)

"دلہن نے اتارا نہ تھا سُرخ جوڑا　　کہ دُولہا نے دنیائے فانی کو چھوڑا
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ　　ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ"

"نماز اِک بھی ہرگز نہ اُس نے قضا کی　　شب و روز کرتا عبادت خدا کی،
جدھر دیکھتے ہیں اُدھر غم ہی غم ہے　　کریں اس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے"

وہ کس پیار سے مجھ کو کہتا تھا خالا — بہت تھا وہ سیدھا بہت بھولا بھالا
جدائی میں اُس کی ہوا دل دِوانا — کہ لگتا ہے اچھا نہ پینا نہ کھانا"

"ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا — خدا کی قسم ہم سے وہ مل کے جاتا
جگر کا وہ ٹکڑا تھا آنکھوں کا تارا — ہمیں اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا"

"نہ رو رو کے بے حال ہو اے دلہن تو — نہ کر اس قدر آہ رنج و محن تو
وہ جنت میں خوشیاں منائیگا مت رو — وہ حوروں سے اب دل لگائیگا مت رو"

"جمیلہ خدا کی قسم مسکرا دے — تیری بے قراری نہ ہم کو رُلا دے
وہ آخر ہمیں بھی تو تھا جاں سے پیارا — مگر دے لیا ہم نے دل کو سہارا"

"نہ کر بین اتنے، نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

(۳)

رضیہ ذرا گرم چاول تو لانا — ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ — ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ"

"جمیلہ مجھے روغنی نان دینا — وہ فرنی اٹھانا وہ پکوان دینا
جدائی میں اس کی ہوا دل دِوانا — کہ لگتا ہے اچھا نہ پینا نہ کھانا"

"منگانا پلاؤ ذرا اور خالہ — بڑھانا ذرا قورمے کا پیالہ
جدھر دیکھتے ہیں اُدھر غم ہی غم ہے — کریں اُس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے"

یہ نبھتی کے زردے میں کشمش ہے تھوڑی — بہت دیر سے مانگتی ہے نگوڑی
وہ ٹکڑا جگر کا تھا آنکھوں کا تارا — ہمیں اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا"

"پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈالڈے کا — خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دلہن سے کہو آہ اتنی نہ روئے — بیچاری نہ بیکار میں جان کھوئے"

"اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے
یہ چھچھڑا لکھا تھا مقدر میں میرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

"دلہن گھر میں چورن اگر ہے تو لانا
نہیں تو ذرا کھاری بوتل منگانا
بہت ہی مزیدار تھا تیرا کھانا
بڑھا کر ذرا ہاتھ مجھ کو اُٹھانا"

"نہ کر بین اتنے نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری"

○

پارٹیشن

"بہنا سنگھا کلمہ پڑھ!"
"لا الٰہ"..... آگے بڑھ!"
"آگے آپ بتا دیجے
میری جان بچا لیجے"
"آگے مجھے اگر آتا
تم سے میں کیوں پڑھواتا

سوچ نہ اب بیکار رحیم
مار اس کو تلوار رحیم
دُور ہوں اِس کے سب دُکھڑے
کر دے اِس کے دو ٹکڑے

جنّت میں بے چین رہے تھے دوزخ میں آرام کیا

پیر اور مُرید

(۱)

کھٹ کھٹ کھٹ !

در پہ کھڑا ہے کب سے، آپ کا دیوانا
جنت کا دروازہ، کھولیے مولانا

چاند ہے، آدھی رات حسیں ہے
دیکھنے والا کوئی نہیں ہے

لایا ہے اِک "چیز" مرید مستانا
جنت کا دروازہ کھولیے مولانا

شیطانی کے داؤ چلا کے
لایا ہوں اِک حُور بھگا کے

رکھ لیجے آغوش میں میرا نذرانہ
جنت کا دروازہ کھولیے مولانا

توبہ کتنی دیر لگائی!
ہاں ہاں میں شیطاں ہوں بھائی!

آپ کی شمعِ رُخ کا پرانا پروانہ!
جنت کا دروازہ کھولیے مولانا

چل دوں گا میں پیر دبا کے
آپ کو میٹھی نیند سُلا کے

چھلک نہ جائے میرے صبر کا پیمانہ
جنت کا دروازہ کھولیے مولانا

○

اجی پہلے آپ

"اجی رکھیے جنت کے در میں قدم!"

"اجی پہلے آپ!"

اجی واہ پہلے نہ جائیں گے ہم

"بھئی پہلے آپ!"

"اجی بات اس میں تکلف کی کیا
قدومِ مبارک بڑھائیں ذرا
اجی چلیے۔ رک جائے گی سب جگہ"

"اجی پہلے آپ!"
"بھئی پہلے آپ!"

اجی بڑھ بھی چکیے خدا کے لئے
سبھی اب تو جنت میں ہیں جا چکے

"تکلف کو اب برطرف کیجئے
نہ اب مجھ سے کہیے خدا کے لئے

"اجی پہلے آپ!"

عنایت ہے، شفقت ہے یہ آپ کی!
مگر مجھ سے یہ تو نہ ہوگا کبھی!
تکلف کی اللہ حد ہے کوئی!
یہیں پر کھڑے ہو گئی اک صدی!

"بس اب پہلے آپ!"
"اجی پہلے آپ!"

"ارے ہو گیا بند جنت کا در
خدایا بتا جائیں اب ہم کدھر؟
نہیں واپسی کے سوا کچھ مفر
چلو بھائی واپس چلیں اب مگر

"ذرا پہلے آپ!"
"اجی پہلے آپ!"

اُونگھ

جنّت کے پیارے جنگل میں ٹھنڈی ہوائیں جھُوم رہی تھیں
رنگ برنگ چُنریاں پہنے حُوریں ہر سُو گھُوم رہی تھیں

نیلی دھُوپ میں اَستادہ تھے جنّت کی مسجد کے منارے
گنبد پہ پرواز کُناں تھے ننّھے ننّھے پنچھی پیارے

چَوڑن کے اِک پیڑ کے نیچے دُودھ کی جھیل کے پاس اِک مُلّا
حلوے کے اِک ڈھیر کے اُوپر سر کو جھُکائے اُونگھ رہا تھا،

○

مَیں اَور شیطان دیکھ رہے تھے

جنّت کی دیوار پہ چڑھ کر میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
جو نہ کبھی ہم نے دیکھا تھا ہو کر حیراں دیکھ رہے تھے

وادیٔ جنّت کے باغوں میں اُف تو یہ اِک حشر بپا تھا
شیطاں کے ہونٹوں پہ ہنسی تھی میرا کلیجہ کانپ رہا تھا

میں نہ کبھی بھُولوں گا تو یہ میں نے دیکھا جو نظّارا
"لعنت! لعنت!" بول رہا تھا جنّت کا ہر منظر پیارا

موٹی موٹی توندوں والے بد صورت بد ہیئت مُلّا

خوف زدہ حوروں کے پیچھے　　　بھاگ رہے تھے کہہ کے "ہا ہا!"

"بچ کے کہاں جاؤ گی"؟ کہہ کے　　　وہ دیوانے ناچتے گاتے
چار طرف سے گھیر کے اُن کو　　　ہنستے، کُدکتے، شور مچاتے

ڈر کے چیخیں مار رہی تھیں　　　حُوریں ریشمی ساڑھیوں والی
اُن کے دل دھک دھک کرتے تھے　　　دیکھ کے شکلیں داڑھیوں والی

میں اور شیطاں لب بہ دعا تھے　　　"اے اللہ بچانا اِن کو
اپنے رحمت کے پردے میں　　　اے معبود چھپانا اِن کو"

جہنّم میں غُنڈے

فرشتوں نے جب مجھ کو دوزخ میں پھینکا　　　ڈسا مجھ کو اِک سانپ نے پہلے آ کر
پھر اِک کالے بچھّو نے "چُٹکی" بھر لی　　　پھر اک بھڑ نے کاٹا مجھے مُسکرا کر

جہنّم کے بہکے ہوئے باسیوں نے　　　مجھے دیکھ کر قہقہے خوب مارے
چڑیلوں کے دادا یہ بھتنوں کے نانا　　　لگے کہنے "کیسی طبیعت ہے پیارے"؟

بھویں تن گئیں میری غُصّے کے مارے　　　کیا میری فطرت نے مجھ کو اشارا
جہنّم کے اک ایک باسی کو مَیں نے　　　وہیں پہ پچھاڑا، وہیں خوب مارا

اُٹھائی وہاں میں نے ایسی قیامت　　　جہنّم کے باسی جہنّم سے بھاگے

میں لوہے کا لٹھ لے کے تھا پیچھے پیچھے   وہ اُکھڑے قدم رہے تھے آگے آگے

گئیں ٹوٹ اُن نامرادوں کی کمریں   بہت اُن کی آنکھوں نے آنسو بہائے
ہر اِک کہہ رہا تھا بچاؤ بچاؤ!   ارے مر گئے مر گئے ہائے ہائے!"

جہنّم کے لوگوں کی دیکھی یہ حالت   تو شاہِ کریمی کو رحم اُن پہ آیا
نکالو نکالو" اسے" جلد باہر!   یہ کہہ کر جہنّم سے مجھ کو بھگایا

"چلو یار منٹو چلو کرشن چندر!   یہ کہہ کر وہاں سے ہُوا میں روانہ
ہمیں دُور سے کر رہا تھا اشارے   سرِ شام جنّت کا موسم سہانا

جب شام جنّت میں ہُوئی

جب شام جنّت میں ہوئی
باغوں میں ہر سُو گھوم کر
حوریں مری گھر آگئیں
چوما ہر اِک کا میں نے مُنہ
چمکار کر پچکار کر
مَیں نے انہیں بہلا لیا
پھر جب گِنا میں نے انہیں
جو سب سے پیاری اُن میں تھی
تھی وہ ہی گم
رہتا تھا گھر کے پاس ہی

کافر ادا اِک مولوی
میں نے گرج کر یہ کہا
اُس سے کہ "او ملعون ادھر
آ تو ذرا
سچ سچ بتا کیا بات ہے؟
ورنہ دبوچوں گا ترا موٹا گلا"

جنت میں حسینوں کی بھوک ہڑتال

(۱)

داروغۂ جنت۔

اے بہت سی خوب صورت عورتو — اس طرح جنت میں آہیں مت بھرو
مہ لقاؤ گر نہ کچھ کھاؤ گی تم — ایک دن جنت میں مر جاؤ گی تم
کس کی یاد آتی ہے تم روتی ہو کیوں؟ — رات کو کانٹوں پہ تم سوتی ہو کیوں؟
آنسوؤں سے تر ہوئے کتنے رومال — پیاس سے کملا گئے ہیں سرخ گال
جو تمہیں تکلیف ہے مجھ سے کہو — وادیٔ جنت میں بھوکی مت رہو
صف بہ صف دیکھو یہ ریڑی کے پہاڑ — اِن کو کھاؤ لے کے تم گھونگھٹ کی آڑ
جگمگائیں اِن پہ چاندی کے ورق — ہم نے چھڑکے اِن پہ پھولوں کے عرق
دُودھ کی جھیلوں پہ بالائی بھی ہے — کھوئے کی بطخوں پہ رعنائی بھی ہے

سیر کر لو اے کے اِک مصری کی ناؤ   میٹھی میٹھی ہے ہوا جنّت کی، کھاؤ
جوہڑوں میں موتیوں کی کھیر ہے   "خوابِ ہستی" کی یہی تعبیر ہے
ہر طرف شربت کے فوّاروں کا شور   ناچتے ہیں ہر طرف برفی کے مور
رَس گلّے سڑکوں پہ ہیں بکھرے ہوئے   جیسے تارے عرش پر نکھرے ہوئے
اے حسیں پریو! انہیں چُن چُن کے کھاؤ   اِن پہ یہ نمکین آنسو مت گراؤ،
دیکھو یہ گاجر کے حلوے کے محل   واہ ری بزمِ خدائے عزّ و جل،
توڑ کر اِک "اینٹ" چکھو تو سہی   پیٹ میں اِک "اینٹ" رکھو تو سہی
یہ نہیں پربت یہ ہیں سوہن کے کیک   کھاؤ اِن کو کرسیوں کی لے کے ٹیک
یہ شکر کی ہے سڑک کھا جائیے   میٹھے کنکر نوشِ جاں فرمائیے
آ رہے ہیں وُہ جو شُتر بے مہار   لا رہے ہیں یہ مربّے بے شمار
پیڑ جنگل کے ثمر بر دوش ہیں   مت ڈرو میدے کے یہ خرگوش ہیں
آم یہ لنگڑے ہیں پر لنگڑے نہیں   طوطوں سے پوچھو نہ گر آئے یقیں
توڑ لو پیڑوں سے یہ خوبانیاں   مت کرو بیکار آنا کانیاں
ننّھے پنچھی سب تمہارے ہیں غلام   چاہو تو اُن کو پکارو لے کے نام

اپنے اپنے آشیانے چھوڑ کے   لائیں گے جنّت کے یہ پھل توڑ کے
سب کے سب پھل تم کو یہ کر دینگے پیش   مطلقاً اِن کو نہیں کچھ فکرِ خویش
اپنی چونچوں سے کھلائیں گے تمہیں   رو رہی ہو تم ہنسائیں گے تمہیں

گر حسینوں کو نہیں میٹھا پسند
میں ابھی حاضر کروں پکوان چند!

(۲)

یہ حَبَش کے نان، یہ شامی کباب   ہو سکے تو کھائیے عالی جناب
شوربا ہُدہُد کا تھوڑا لیجئے   کچھ چپلاؤ ہی تناول کیجئے
کوفتے بگلے کے یہ چکھیئے ذرا   اِک اُٹھا کر مُنہ میں تو رکھیئے ذرا
ہنس کے یہ گھونگھٹ فدا سر کائیے   "نہرِ الفت" کی یہ مچھلی کھائیے
یہ شُتر مُرغوں کے انڈے ہیں حضور   قاب میں رکھا ہے مُرغِ کوہِ طور
ضِد نہیں کیجے اجی باز آئیے   مور کا تھوڑا متنجن کھائیے
ننّھی چڑیوں کے سری پائے ہیں یہ   خوش ہوا ہے جس نے بھی کھائے ہیں یہ
یہ دلِ بُلبُل کا ایرانی اچار   لے وہ چٹخارے جو کھائے ایک بار

یہ دمّن کی پیاز یہ عربی سلاد
کھائے جو، برسوں کرے وہ اس کو یاد

جسم گرمی سے اگر گھبرائے ہیں
ہم چمکتے مور چھل بھی لائے ہیں

وادیٔ جنّت سے کیوں بیزار ہو؟
خودکشی کرنے پہ کیوں تیار ہو؟

بات کیا ہے دُلھنو یہ تو بتاؤ
جوڑتا ہوں ہاتھ غصّے میں نہ آؤ

اشک کیوں چھٹے ہوئے ہیں گال سے
پونچھ ڈالو ریشمی رومال سے

(۳)

عورتیں :—

جاؤ جاؤ کچھ نہیں کھائیں گے ہم
فیصلہ یہ ہے کہ مرجائیں گے ہم

عورتیں سب سیدھی راہوں پہ چلیں
شمعِ نیکی بن کے دُنیا میں جلیں

گھر سے باہر عیش جب کرتے تھے مرد
گھر میں ہم بھرتے تھے آہیں سرد سرد

ہنس کے سہہ لیں زحمتیں اولاد کی
ہم نے دُنیائے خدا آباد کی

کردیا پورا ہر اِک حکمِ خدا
اُس کا ہر فرمان ہم لائے بجا

حکم تھا شوہر مجازی ہیں خدا
اُن سے ہو سکتی نہیں عورت جدا

ہم تھے سیدھے آ گیا ہم کو یقیں
تھی خبر کس کو حقیقت یہ نہیں

اُن کی اُلفت اپنی فطرت بن گئی
گھر کی دوزخ اپنی جنّت بن گئی

چونکہ تھی شوہر پرستی فرضِ عین
اُن سے پٹ پٹ کے ہمیں آتا تھا چین

اب تو ہر عورت فدائے مرد ہے
اپنے اپنے مرد کی ہمدرد ہے

آج جب ہنگامِ محشر آگیا
سامنے کچھ اور نقشہ چھا گیا

یک بیک دشمن ہمارے ہو گئے
مرد سب دوزخ کو پیارے ہو گئے

ہو گئے گر ان بچاروں سے گناہ
کر رہے ہیں آپ کیوں ہم کو تباہ؟

دل بھلا کیوں دیں گے بیگانوں کو ہم
پیٹ دیں گے آج غلمانوں کو ہم

ہم کو دیکھیں تو یہ اُن کی یہ مجال
نوچ دیں گے اِن کے لمبے لمبے بال

اپنا اپنا ہم کو "شوہر" چاہیئے
کچھ نہیں بس ہم کو شوہر چاہیئے

وہ ہیں بھوکے اور ہم جنّت میں کھائیں
وہ جُدا ہیں اور ہم خوشیاں منائیں

کچھ بھی ہو وہ ہیں شریکِ زندگی
زندگی میں اُن سے ہے تابندگی

سچ تو یہ ہے وہ نہیں کرتے گناہ
دوستوں نے کر دیا اُن کو تباہ

رشید احمد کے گھر دعوت اڑا کے ہوا میں گھر میں داخل ٹھنکا کے
مری کٹیا میں وہ بیٹھی تھی غمگیں کہا میں نے "ہو کیسی بلبلِ چیں!"
نہ دو دن سے ملا تھا اس کو کھانا مگر یہ راز بندے نے نہ جانا
حسیں سا ایک مصرع گنگنا کے کہا میں نے یہ اُس کے پاس آ کے
"وزیر آغا کی تازہ نظم سن لو ذرا کچھ شاعری کے پھول چن لو"
اب اس کے صبر کا پیمانہ چھلکا پڑا پیلا، گلابی رنگ ہلکا
وہ غصے کی شکن ماتھے پہ لائی معاً دینے لگی وہ یوں دُہائی
"ترے ساتھ آ گئی پھوٹے مرے بھاگ وزیر آغا کی نظموں کو لگے آگ
ارے چھوٹی سی تھی میں نظم آزاد کیا پابند تو نے مجھ کو جلاد
ادب نے کر دیا برباد تجھ کو نہ اپنے ساتھ کر ناشاد مجھ کو
زباں پر ذکرِ منٹو دن میں دس بار کبھی لا کر نہ دی اک "کالی شلوار"
لحاف اک بھی نہیں وہ ذکرِ عصمت بتا دے یہ کہاں کی ہے شرافت
تبسم واجدہ کا کیا کروں گی؟ میں اُس سے پیٹ کیا اپنا بھروں گی؟
مرا دل بھوک سے رنجور سا گر ہے مجھے کیا ہاجرہ مسرور اگر ہے
کلامِ میر بھی ہے جوش بھی ہے نہیں ہے گھر میں آٹا ہوش بھی ہے؟

اگر فاقوں سے آیا غیظ مجھ کو سنایا فیض احمد فیض مجھ کو
ہوئی جب چائے کی بندی کو خواہش کہا "پڑھ لو ذرا احسان دانش"
نہ مجھ ناشاد کی پروا کبھی کی جو کی تو فکر شاد امرتسری کی
کبھی آنسو نہ بندی کے سکھائے بڑے صوفی تبسم بن کے آئے
اگر تجھ کو نہ دیتا داد داہی نہ آتی میرے گھر پر یہ تباہی
کیا ہے جعفری نے تجھ کو برباد جو آ کر دے گیا جھوٹی تجھے داد
صلاح الدین اگر کٹیا میں آیا تو سمجھو میں نے واویلا مچایا
بہت سودا ادب کا سر میں ہوگا وہ مولانا اگر ہے گھر میں ہوگا
نہ گھر میں اختر الایمان آئے نہ اپنا وہ یہاں ایمان لائے
اُسے چاٹو گے جو بوگے یہ ہے طے مگر وہ جعفرِ اسود تو نہیں ہے
یہاں پر منتظر ایوبی جو آیا سمجھ لو میں نے ڈنڈوں سے بھگایا
دکھاؤں گی میں اس کو اپنے تیور کہ ہنستا آئے گا جائے گا رو کر
جو راشد کی سنائی نظم آزاد ترے ساتھ اُس کو بھی کر دوں گی برباد
بڑی مشکل سے پیچھا تھا چھڑایا وہ کیوں ایران جا کر لوٹ آیا؟
مرے دو اشتراکی احمد عباس وہ کر دے گا تو ابھی ستیاناس

توڑتے اُن کی شرافت لے کے بانٹ
بعد میں کرتے اُنہیں دوزخ الاٹ

دی سزا اور کچھ نہ کی انکوائری
یہ تو ہے "سرمائکل اڈوائزری"

سب فرشتوں کی غلط ہے ڈائری
کچھ حقیقت اور زیادہ شاعری

کیا وہ کرتے اُن پہ جب آیا شباب
کچھ چھنالوں نے کیا اُن کو خراب

بزمِ دُنیا میں بھی یہ تھیں اُنکے ساتھ
آ گئے دوزخ میں بھی یہ اُنکے ہاتھ

کھولتا ہے خون وہ آیا ہے طیش
ہو رہے ہوں گے جہنم میں بھی عیش

نعرہ برلب ہاتھ میں ہیں جھنڈیاں
لے چلو جی ہیں جہاں وہ رنڈیاں

دیکھتے ہی اُن کو اُٹھ جائیں گے ہات
زور سے دیں گے کمر پہ ایک لات

کھٹ سے جب گھونسہ پڑے گا ناک پہ
رو کے گر جائیں گے فرشِ خاک پہ

جب پڑے گی پیٹھ پہ لوہے کی سیخ
اِن چھنالوں کی نکل جائے گی چیخ

آج دوزخ میں وہ ہوگا قتلِ عام
رو دیں گے سب سانپ اور بچھو تمام

لمبی لمبی لاٹھیاں چل جائیں گی
پونیوں کو نانیاں یاد آئیں گی

ساڑھیاں اور بلاؤز سب پھٹ جائینگے
چوٹیوں کے ساتھ سر کٹ جائیں گے

کر کے اُن کی لمبی زلفیں تار تار
ہم پہنائیں گے اُنہیں جوتوں کے ہار

لنگڑے اور کانے گدھے منگوائیں گے
"دلہنوں" کو اُن پہ ہم بٹھلائیں گے

اِن کو پھر پلوائیں گے شوہر کا جوس
ہر جگہ اُن کا نکالیں گے جلوس

تھام لیں گے پھر گریبانوں سے ہم
بیاہ دیں گے اُن کو شیطانوں سے ہم

شوہروں کو آج واپس لائیں گے
ہم کھلا کر اُن کو پھر خود کھائیں گے

ہاں کھڑی ہو جاؤ اب تم صف بہ صف
کوُچ کر دو اب جہنم کی طرف

"زور سے بولو کہ شوہر زندہ باد!"
"شوہروں کی بیویاں پائندہ باد!"

شاعر خدا کے دربار میں

تیری دُنیا میں سن لے آج تک کیا کیا کیا مَیں نے
کوئی چھ سو ستاون مہ رُخوں کو دل دِیا مَیں نے

شبستانوں میں میرے رات بھر اکثر رہیں پریاں
صدا روشن رکھا اپنے گناہوں کا دِیا مَیں نے

برہنہ لڑکیاں جب میرے آگے رقص کرتی تھیں
اِنہی آنکھوں سے لُوٹی اُن کے جسموں کی ضیا مَیں نے

مرے گستاخ ہونٹوں پہ بُتوں کے نام رہتے تھے
ترا جب نام آیا اپنے ہونٹوں کو سِیا مَیں نے

حسیں کالی گھٹا لہرائی جب بھی صحنِ گلشن پر
تو اِس عالم میں مے خانے کا مے خانہ پیا مَیں نے

مگر سب سے بڑا یہ جُرم میرا ہے میرے آقا
غلط اک قافیہ دیواں میں اپنے لکھ دیا مَیں نے

○

میرا دوست

السّلام اے ہمدمِ دیرینہ شیطانُ الرّجیم
ہر ادا پہ تیری عاشق ہے میرا ذوقِ سلیم
تُو نے بن مانگے ہی پوری کی میری ہر اک مُراد
ہوں اگر انسان پہ احسان ہیں رکھوں گا یاد
سب تیرے دشمن ہیں لیکن میں ثنا خواں ہوں تیرا
اے عظیم الشّان افسانے میں عُنواں ہوں تیرا
مرحبا صد مرحبا اے شاطرِ افلاک و ارض
حکم دے مجھ کو تو میں پورے کروں کچھ تیرے فرض
بزمِ عالم میں نہ قدرت دے سکی تجھ کو شکست
تُو نے تلپٹ کر دیا ہے انتظامِ بُود و ہست

دبدبہ پھیلا ترا صحرا بہ صحرا یم بہ یم
نیکیوں کو روند دیتے ہیں تیرے وحشی قدم
رحم آ جاتا ہے تجھ پہ، کس قدر مصروف ہے
اِس پہ طُرّہ یہ کہ اُس دربار سے موقوف ہے
کچھ بھی ہو رہتی ہے اِن آنکھوں کو تیری جستجو
آ گلے مل لیں، پُرانے دوست ہیں ہیں اور تُو
کہہ کے میں اللہ اکبر جب بھی پڑھتا ہوں نماز
میرا کچھ نوٹس نہیں لیتا خدائے بے نیاز
سر اُٹھا لیتا ہوں اُکتا کر میں اُس دہلیز سے
خاک دلچسپی "وہ" لے اِک بندۂ ناچیز سے
جب بُلاتا ہوں تجھے اِک پل میں آ جاتا ہے تُو
راستہ سیدھا ہو یا اُلٹا بنا جاتا ہے تُو
"وہ" ہے کتنی دُور اور تُو کس قدر نزدیک ہے
"وہ" ہے اوروں کے لئے میرے لیے تُو ٹھیک ہے

میرے مُرشد کب تلک تیرے لئے آہیں بھروں؟
تو نظر آئے تو ہاتھوں پہ تیرے بیعت کروں،
حشر کے دن جانِ جاں دھوکا نہ دے جانا مجھے
بزمِ دوزخ میں بھی اپنے ساتھ لے جانا مجھے
تو نہیں مانے گا میری تُو حرام الدّہر ہے
تُو مصیبت ہے اذیّت ہے بلا ہے قہر ہے
بھاگ جاہیں تیرے دھوکے میں نہ ہرگز آؤں گا،
میں نہیں اُلّو کہ تیرے جال میں پھنس جاؤں گا

مثنوی قہر البیان

شاعر اور بیاد غار

وزیر آغا سنو میری کہانی
اگرچہ یہ قلم کی ہے زبانی
کہانی درد سے بھرپور ہے یہ
کہ تصویرِ دلِ رنجور ہے یہ
دمِ آغاز "دو نعرے" اور اک "واہ"
دمِ انجام "دو نالے" اور اک "آہ"
جو تارِ دل پہ رکھ دی ہیں نے مضراب
تو ٹکراؤ گے سر ہو ہو کے بیتاب
بہا دو گے یکایک اشک اتنے
فلک کی آنکھ کے تارے ہیں جتنے
مرا کوئی نہیں ہمراز تم سا
میں ڈھونڈوں گا کہاں دمساز تم سا
ابھی سے رو پڑے بچھڑے یار
نہ اتنا رؤ ہو جاؤ گے بیمار

بہے جاتے ہو تم کیوں پانی پانی   ذرا روکو یہ اشکوں کی روانی
ذرا کچھ دور ہٹ جاؤ مرے یار   قلم کی اب چلاتا ہوں میں تلوار

بنامِ شاہد "نازک مزاجاں"
بطیبِ خاطرِ ظالم "سماجاں"

آغازِ داستاں

یہ کوئی چھ برس پہلے کی ہے بات   نہ تھی جب فکر کوئی مجھ کو دن رات
میں بے فکری سے دن بھر گھومتا تھا   پیے بن ہر قدم پہ جھومتا تھا
مری دنیا میں آئی اک حسینہ   پھنسی جیسے انگوٹھی میں نگینہ
ریاضِ خلد کی ہنستی کلی تھی   بڑے ناز و نعم میں وہ پلی تھی
بہاروں کی جبیں مسکان تھی وہ   بلا تھی، قہر تھی، طوفان تھی وہ
مرے چہرے پہ اس کو رحم آیا   نظر ملتے ہی اُس نے دل ملایا
جو میں نے مسکرا کر اُس کو دیکھا   تو جھٹ کھڑکی سے اُس نے پھول پھینکا
نگاہیں پڑ گئیں وہ میرے پیچھے   وہ تھیں بے چین اُوپر اور میں نیچے
ادائیں اُس نے دکھلائیں جو ہنس کر   مرا دل رہ گیا زلفوں میں پھنس کر

چھڑی آغازِ الفت کی کہانی
مگر فی الحال اشاروں کی زبانی

اور اس کے بعد

قدم اب عشق نے آگے بڑھائے   جو ارماں دل میں تھے ہونٹوں پہ آئے
ملاقاتیں ہوئیں دو چار چھپ کر   محبت کے ہوئے اقرار چھپ کر
وہ بولی "ہر مصیبت میں سہوں گی   خوشی سے تیری کٹیا میں رہوں گی
میں لعنت بھیج دوں گی اپنے گھر پہ   چلی آؤں گی میں سب لے کے زیور"
یہ سُن کر میں نے کی جب کچھ پس و پیش   وہ بولی "مت کرو فکرِ کم و بیش
بہت کچھ نقد بھی لاؤں گی پیارے   مری لاکھوں امیدوں کے سہارے
محبت کا خزانہ ہوں چرا لو   مجھے فوراً اب اس گھر سے بھگا لو
بہت سے آ رہے ہیں گھر میں پیغام   نہ ہو جائے جوانی میری نیلام

نہ ٹھہراؤ مجھے جلاد بن کر
کہیں اب لے چلو فرہاد بن کر"

میرا اغوا

ملی ندیا پہ مجھ کو دوسرے دن   لگی کہنے "رہوں گی اب نہ تجھ بن"
کہا میں نے "ارے میں تو ہوں شاعر"   وہ بولی "یعنی دل لینے میں ماہر"
"وہ جی ہاں" کہہ کر جو میں نے سر جھکایا   مری سمت اس نے ہاتھ اپنا بڑھایا

کلائی تھام کر بولی "چھوڑ ہاتھ"
"ارے دستِ زلیخا ہے مرا ہاتھ"
پکڑ کر مجھ کو لے آئی مرے گھر
پسینہ آگیا میری جبیں پر
لگی کہنے "ملے کس نازنیں سے؟
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے"
ندی پر سے تجھے بیتی اُڑا لائی
تجھے میں تیرے ہی گھر میں بھگا لائی"

مرا گھر کیا تھا؟ اک چھوٹی سی کٹیا
یہیں ڈوبی مری قسمت کی کُٹیا

طوفاں "بہ" حباب "اندر"

حسیں قوسِ قزح گھر آگئی تھی
یہ بدلی سب جہاں پر چھا گئی تھی
ملاتی جب وہ آنکھیں ہو کے مدہوش
محبت کھول دیتی ہلتی کے آغوش
میں سُن کر اُس کے پائل کی چھما چھم
بہا دیتا خوشی میں دل کا ہر غم
جب اُس کی چوڑیاں ٹکرا کے بجتیں
ہزاروں دلہنیں سی دل میں سجتیں
سرودِ سرمدی تھی اُس کی آواز
کہ جیسے بج رہے ہوں سینکڑوں ساز
سراسر نغمہ تھی وہ سنگیت تھی وہ
غزل تھی وہ، سراپا گیت تھی وہ
جب اُس کے دیکھتا مہندی رچے پاؤں
میں کہتا "اِن پہ گرنے کے لئے آؤں؟"
وہ جب اُن سرمئی آنکھوں سے تکتی
جنوں بن کر محبت سر میں تکتی

لیے شانوں پہ زلفوں کی گھٹائیں
لگا کر عطر پھرتی دائیں بائیں
وہ رُعبِ حسن اِس بندے پہ چھاتا
کہ بندہ دُور ہٹ کر سہم جاتا
مگر اک روز جرأت سے لیا کام
محبت سے لیا اُس شوخ کا نام
کہا پھر میں نے اُس سے تھام کر ہات
"اِدھر دیکھو! آج ہے کتنی حسیں رات
حیا کے پھینک دے رنگین پردے
مجھے ہر قید سے آزاد کر دے
میں کیسے اتنے ارمانوں کو رد کر دوں؟
میں کیونکر آئے طوفانوں کو رد کر دوں؟"
بڑھی وہ میری جانب ہو کے مدہوش
ریاضِ خلد تھی شاعر کی آغوش
مجھے دے دی نویدِ وصل اُس نے
پلا ڈالی "شرابِ اصل" اس نے

وہ دُلہن سی بنی ہر رات میری
عجب ہر رات تھی ہیہات میری

عہد و پیماں

غم و آلام سب سوئے ہوئے تھے
نہ جانے ہم کہاں کھوئے ہوئے تھے
جدا اک پل بھی وہ مجھ سے نہ ہوتی
خوشی سے رات بھر ظالم نہ سوتی
گلے میں ڈال بانہوں کا حسیں ہار
جگا دیتی مجھے شب میں کئی بار
نگاہوں سے وہ کرتی یہ اشارے
نہ سوؤں گی نہ سونے دوں گی پیارے

مجھے وہ وہ ادائیں وہ دکھاتی — خوشی میں "گستی" دل ڈوب جاتی
کھِلا کر آرزوؤں کا وہ گلزار — یہ کہتی "آمرے پہلو میں دلدار
"اگر فردوس بر روئے زمین است — ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است"
کبھی شاعر، خدا! مجھ سے نہ ہونا — نہ اپنی عاشقی کی لاج کھونا
ترے بِن ایک پل جینا ہے دشوار — جہاں فانی، نہیں فانی مرا پیار
کسی دن کھو دیا گر میں نے تجھ کو — سمجھ لے موت آجائے گی مجھ کو
میں تیرے ساتھ فاقے بھی کروں گی
تری آغوش میں ہنس کر مروں گی"

ہر روز روزِ عید

نہ تھی کچھ فکر ہم کو مالِ زر کی — حقیقت سے محبت بے خبر تھی
بکے زیور، مزے ہم نے اُڑائے — وفا کے گیت ہم نے گنگنائے
نہ کھائے تھے کبھی ہم نے جو کھانے — کھلائے پیٹ بھر بھر کر خدا نے
بھری مرغی، بہ چینی دن میں دو بار — تھی دستر خوان پر کھانوں کی بھرمار
مرے گھر دودھ کی نہریں تھیں جاری — پھلوں کے ٹوکرے تھے بھاری بھاری
میں رس سیبوں کا پیتا دن میں دس بار — مٹھائی کے لگے رہتے تھے انبار

عجب دن تھے عجب تھیں پیاری راتیں — زباں پر ہر گھڑی لاکھوں کی باتیں
کہا جب دل نے جھٹ ٹکٹیں منگالیں — ہزاروں ہم نے فلمیں دیکھ ڈالیں
سدا ہم ٹیکسیوں میں گھومتے تھے — وہیں اک دوسرے کو چومتے تھے
گئے کپڑے پُرانے سِل گئے سُوٹ — گئی چپل پُرانی - آگئے بوٹ
ہوئے معلوم سینٹ اور عطر کے بھاؤ
سنی جتنی بھی قیمت جھٹ کہا: "لاؤ"

مَیں اور ٹَیں

ملازم پانچ رکھے میں نے ہشیار — سلام اُن سے کراتا دن میں چھ بار
ملاقاتی جو میرے گھر پہ آتے — وہ اکثر منہ کی کھا کر لوٹ جاتے
مرے در پر کھڑا رہتا تھا جو "گارڈ" — وہ کہتا اُن سے لاؤ وزٹنگ کارڈ
بغیر اس کے نہیں ہوتی ملاقات — یہ سب "سرکار" نے دی ہیں ہدایات
نہ ہوتا موڈ میں اس وقت اگر میں — تو کہہ دیتا کہ "صاحب گھر نہیں ہیں"
بہت کم اب ملا کرتا میں گھر میں — کہ ہوتا "وائسرائے کے ڈِنر" میں
میں اکثر چار کو اب فور کہتا — جی یس کیجے کو "او نو مور" کہتا
گئی سب خاکساری، آگئی ٹَیں — "کریون اے" کے سگریٹ پھونکتا میں

محلّے کے امیروں سے الجھنا　　انھیں اُلّو کے پٹھّے میں سمجھنا

مرے گھر سب ادیب آ جا رہے تھے
مزے سے رات دن پی کھا رہے تھے

آسماں کی حرامزدگی

نہ بھایا آسماں کو گھر کا یہ رنگ　　یکایک آپڑی اِس رنگ میں بھنگ
وہ زیور ہی تھے، کتنے روز چلتے　　دیا بجھنے لگا یہ جلتے جلتے
غریبی نے جو دی اس گھر پہ دستک　　سُنائی دی دلوں کی ہم کو دھک دھک
یکایک چونک اُٹھے گھبرا گئے ہم　　ارے اب کیا کریں ہم، چکرا گئے ہم
مجھے محسوس اب ہونے لگا یوں　　کہ سب بیکار تھی میری اکڑ فوں
جب آئے گھر میں فاقے مسکرا کر　　ہوئی وہ غرقِ فکر آنکھیں جھکا کر
دیا عاشق کا پھر بھی ساتھ اُس نے　　نہ جھٹکا عاشقی کا ہاتھ اُس نے
یکایک ہو گئے سب طَور بے طَور　　عجب تھا زندگی کا یہ نیا دَور
وہ روکھی روٹیاں اب کھا رہی تھی　　چنے اب بھاڑ سے بھنوا رہی تھی
وہ ستّو پھانکتی، گٹھلیاں چباتی　　مجھے تکتی، لجاتی، مسکراتی
وہ کہتی پھر گلے میں ڈال کر ہاتھ　　"بہت ہی خوش ہوں میں رہ کر ترے ساتھ"
میں کہتا "واہ! کیا لڑکی ملی ہے　　کلی جنّت کی دوزخ میں کھلی ہے"

رہے نام اللہ کا!

کٹا لے دے کے قرضہ کچھ زمانہ　　چلا کچھ روز یونہی آب و دانہ
کہاں تک قرض ہم لے لے کے جیتے　　سسکنے اب لگے دل زندگی سے
نہ شاعر کو کسی در سے ملا کام　　ہر اک در سے وہ لوٹا ہو کے ناکام
بکیں گھڑیاں، بکے زیور، بکے سوٹ　　کبھی گروی پڑی ساڑھی، کبھی بوٹ
پڑا سامان کچھ گروی، بکا کچھ　　نہ اللہ کے سوا گھر میں رہا کچھ
یہ بھیجا تار آغا خان کے نام　　ہوئی جاتی ہے عزت میری نیلام

خدارا کچھ مدد بندے کی کیجیے
نہیں تو دو روپے ہی بھیج دیجیے

قرض خواہوں سے جنگ

کیا اب قرض خواہوں نے مجھے تنگ　　بہت روکا انھیں، پر ہو گئی جنگ
مگر تھا حوصلے والا بڑا میں　　مجاہد کی طرح اُن سے لڑا میں
کسی کو اپنے گھونسوں سے پچھاڑا　　کوئی ترچھا گرا اور کوئی آڑا
کسی کنجڑے کو دے کے بھیجا گالی　　کسی کی جیب سے نقدی اڑا لی
جو گھر میں روز دے جاتا تھا انڈے　　گیا وہ تڑ کے تڑ کے کھا کے ڈنڈے

کئی خم ٹھونک کر آئے جو آگے — معاً عزت بچا کر اپنی بھاگے
دوّنی دے کے بھنگی کو رُلایا — اکنّی دے کے ہر نوکر بھگایا
بہت ظلم اس "حقی بھنڈ" نے ڈھائے — خدا اس کو جہنم سے بچائے

کہو اے پڑھنے والو مل کے آمیں
کہ دشمن کی بھی کی نہ توہیں

حسینہ سے میری پہلی مکاری

یونہی گزرے کئی دن اور راتیں — کبھی الفت، کبھی فاقوں کی باتیں
تھا اپنے شہر کا شاعر بڑا میں — بہت سی اس پہ نظمیں لکھ گیا میں
میں بیڑی پھونکتا رہتا بہ آرام — نہ تھا کچھ اس پہ مرنے کے سوا کام
جب اس کا بھوک سے دم لب پہ آتا — میں اس کو گیت لکھ لکھ کر سناتا
عجب سوجھی مجھے اک روز تدبیر — پڑے جس سے کہ "ان قدموں" میں زنجیر
یہ سوچا شاعری اس کو سکھا دوں — یہ اُلٹی راہ اس کو بھی دکھا دوں
بنی پھرتی ہے اب جو شاہزادی — بنادوں اس کو بھی فاقوں کا عادی
اُسے بھی شاعری کی ڈال کر چاٹ — کہوں "لے تو بھی اب رو رو کے دن کاٹ"

پھنسے ایسی کہ پھر جانے نہ پائے
یہیں پر بیٹھ کر گرہیں "لگائے"

پہلا سبق

دیا پہلا سبق اُس مہ لقا کو — مسلماں کر لیا کافر ادا کو
بتایا کیا ہے "سکتہ" کیا ہے "ابہام" — یہ "خوبی" آجکل کیوں ہو گئی عام
ہے "ایطائے جلی" کیا اور "خفی" کیا — ہے کوچہ یار کا کیا اور گلی کیا
میں کہتا "جاہلاتن جاہلاتن" — پکارو "فاعلاتن فاعلاتن"
جب اُس کا دیکھتا میں پھول سا مُنہ — وہ کہتی "فاعلاتن فاعِلن اُوہنہ!"
بہت سی اس کو جب بحریں سکھا لیں — "کلامِ میر" کی غزلیں رٹا لیں
قصیدے ذوق کے اُس کو "پلائے" — اسے غالب کے سہرے بھی سنگھائے

دیئے پھر شاعری پر ایسے لیکچر
سُنے جو اس پری پیکر نے ہنس کر

شاعرِ اصلی کی تعریف

کہا میں نے کہ جو شاعر ہے اچھا — ضروری ہے کہ ہو اُلو کا پٹھا
نہ ہرگز زندگی میں کچھ کرے کام — ہر اک در سے وہ ہو کے لوٹے ناکام
سدا وہ زندگی برباد رکھے — جو ممکن ہو تخلص شاد رکھے

پڑھائی" اُس نے چھوڑی ہو ادھوری — نہیں تعلیم اُس کو کچھ ضروری
رہے "اوجِ شاعری" فاقوں سے مرنا — فلک پر رو کے ہر الزام دھرنا)
بُرے معشوق کی صفتیں کرے وہ — وہ کیسا بھی ہو بس اُس پہ مرے وہ
اگر ہو بدچلن بھی اُس کا معشوق — نہ مارے اس کو لاٹھی اور نہ بندوق
خوشی سے یہ کہے تو بے وفا ہے — مگر پھر بھی مرا یہ دل ترا ہے
بھرے سرد آہیں دل کو تھام کر وہ — بنا رومال روئے رات بھر وہ
کوئی تیرِ نظر دل میں لگا ہو — "غمِ دردِ جگر" میں مبتلا ہو
لکھے غزلیں کرے پیدا وہ بچے — جو ممکن ہو تو دو دو ہوں اکٹھے
سدا بھوکے اُٹھیں بھوکے وہ سوئیں — اگر روئیں تو سب وہ مل کے روئیں
حسیں بیوی کے کپڑے مل گئے ہوں — اور اس کے منہ پہ لونے چھونکے ہوں
رکھے پتلون گروی اور پیسے — بالآخر بیچ ڈالے اپنی ہر شے
کھلے رکھے وہ شب کو اپنے دیدے — گِنے تارے، لکھے سہرے قصیدے
پھر اپنے پر چھُری اس طرح چلوائے — کلام اپنا کہیں بھی مفت چھپوائے
غزل اپنی ترنّم سے سُنائے — اگر ممکن ہو تانیں بھی لگائے
کلام اُس کا اگر کرنے لگے پور — اگر محفل میں برپا ہو کبھی شور

نہ جی ہارے وہ پڑھتا ہی چلا جائے — رہِ ہمت میں بڑھتا ہی چلا جائے
یہ سب سُن کر لگی کہنے مری جاں
"اور اس کا نام ہو مہدی علی خاں"!

شاعری پہ ایک لیکچر

کہانی اصل شاعر کی سُنا کر — دیا اک شاعری پہ اس کو لیکچر
نظر آئے نہ جو شئے وہ کمر ہے — نظر آجائے جو تیرِ نظر ہے
لبِ معشوق ملتے ہیں مَن میں — کہیں ملتے نہیں اپنے وطن میں
نہ ہو معشوق کے گالوں پہ گر تِل — کسی کا اس پہ آ سکتا نہیں دل
نہ ہوں گر تِل تو بنیے سے منگا لو — اُٹھا کر ایک دو خود ہی لگا لو
بچے گا تل کے جلووں سے کوئی کب — فنا ہو جائیں گے اہلِ نظر سب
جو دیکھے گا وہ ہو جائے گا برباد
کوئی مجنوں بنے گا، کوئی فرہاد

معشوق کی چال

کسی معشوق کی اپنی نہیں چال — وہ اوروں کی ہے منّت کش بہر حال
کسی کو مورنی چلنا سکھائے — کسی کو "فن" یہ بی ہرنی بتائے

کسی کی چال میں مستی اگر ہے   تو سمجھو اس پہ ہاتھی کی نظر ہے
نہ آئے تم کو گر چلنا ادا سے   تو جا کر سیکھ لو بادِ صبا سے

یہ بوٹے چھوٹ بچے چلتی ہے پیاری
گلستاں در گلستاں کیاری کیاری

معشوق کی زلفیں

اگر تم کو کوئی ناگن نظر آئے   تو یہ سمجھو کسی کی زلف لہرائے
مگر اس زلف سے خود کو بچانا   تمہارا ہاتھ اس کو مت لگانا
یہ چلتی پھرتی چڑیا کاٹ لے گی   تمہاری زندگی سب چاٹ لے گی
کوئی زلفوں کو "لمبی شب" بتائے   جو "اندھوں" کو نظر دن میں بھی آئے

ہر اک مجرم نے جو پہنی ہے زنجیر
وہ داروغے کی ہے زلفِ گرہ گیر

قدِ محبوب

قدِ محبوب کتنا ہو بتاؤں   چلو اک سرو میں تم کو دکھاؤں
نہیں یہ بحث چھوٹا یا بڑا ہو   ضروری ہے کہ گلشن میں کھڑا ہو
قیامت سے بھی ہے تشبیہہ اس کی   اگرچہ کچھ نہیں توجیہہ اس کی

اچھی آنکھیں

جو اچھی آنکھ کی پہچان چاہو   کہیں سے پھول نرگس کا منگا لو
نہ آنکھیں ہوں اگر بیمار آنکھیں   سمجھ لینا یہ ہیں بےکار آنکھیں
مگر یہ شرط بھی ہے ہوں گلابی   بڑی جتنی کہ ساسر اور رکابی

بہت سے لوگ انہیں کہتے ہیں بادام
شرابی لوگ کہتے ہیں انھیں جام

متفرقات

اگر تم ڈوبنا چاہو مری جاں   تو ہے اس کے لیے چاہِ زنخداں
کسی کے ہاتھ میں دیکھو جو تلوار   لیے پھرتا ہے سمجھو ابروئے یار
کبھی بجلی جو گرتی ہے فلک سے   تو دل سینے میں رہ جاتے ہیں دھک سے
اگر بجلی گرا دے ہنس کے معشوق   نہ آئے گی صدائے توپ و بندوق
سڑک پر گر نہ مٹی ہو نہ ہو دھول   وہاں بکھرے ہوئے ہوں جا بجا پھول

سمجھ لینا حسیں کوئی ہنسا ہے
"ابھی اس راہ سے ہنس کر گیا ہے"

عشق کا موسم

یونہی گزرے کئی راتیں کئی دن — عجب تھی زندگی خوراک کے بن
وہ بولی ایک دن "دل میں اٹھی ہُوک" — میں بولا "کیوں"، وہ جھٹ بولی "لگی بھوک"
کہا میں نے کہ "لا دوں گا میں کھانا" — مگر پہلے "سبق" پچھلا سُنانا
ادھر آؤ سکھاتا بعد میں ہاں — سناؤ "عشق کے موسم" کا کچھ حال
تمہارا امتحاں میں آج لوں گا — جو تم گر پاس کھانا لا کے دوں گا
وہ بولی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر — مجھے پچھلا "سبق" سارا ہے ازبر
جنوں اٹھتا ہے جب آتی بہاریں — چمن میں گل گریباں اپنا پھاڑیں
نہیں جینے ۔ یہ مرنے کا ہے موسم — کسی سے عشق کرنے کا ہے موسم
اسی موسم میں کھو جاتے ہیں شاعر — قفس میں بند ہو جاتے ہیں شاعر
تڑپتے ہیں مچلتے ہیں وہ ہر سال — صبا سے پوچھتے ہیں باغ کا حال
مگر رہتی ہے وہ مغموم و خاموش — یہ سر ٹکرا کے ہو جاتے ہیں بے ہوش
قطاروں میں رکھے رہتے ہیں گملے — کہ بھنورے کر سکیں کلیوں پہ حملے
کرا لیتی ہیں کلیاں عشق بالجبر — وہ ہر سختی کو سہہ لیتی ہیں بالصبر
چمن میں آشیاں ہوتے ہیں اکثر — کہ بجلی گر سکے آ آ کے اُن پر

کبھی گرتی نہیں ہے یہ زمیں پر — جو گرتی ہے تو بس ظالم وہیں پر
یہیں پر آ کے گاتی ہے قمری — "خیال" "استھائی" "ٹپہ" اور "ٹھمری"
پپیہا بھی یہیں اندوہ گیں ہے — کہ وہ سہگل بنا بیٹھا یہیں ہے
یہیں پر بیوہ کوئل غم سے کملائی — غزل گاتی ہے بن کر اختری بائی
صبا کا پوسٹ مین آتا یہیں ہے — لفافے پارسل لاتا یہیں ہے
اسی موسم میں دل دے کر گلوں کو — پڑا کرتے ہیں دورے بلبلوں کو
وہ ہو جاتی ہے اس موسم میں بیمار — کبھی تو خودکشی کرنے پہ تیار

بس اب میں تھک گئی ہوں لاؤ کھانا
خدا کے واسطے جلدی منگانا

ایک ادھ ٹیچر

مری جان تمنّا سو گئی تھی — کہیں ایران جا کر کھو گئی تھی
وہ میری عقل پہ رو دھو گئی تھی — بہت ہی بور شاید ہو گئی تھی
بصد منّت اُسے میں نے جگایا — "پلاؤ" اس کو تھوڑا سا کھلایا
ذرا کھا کر کچھ آیا اُس کو جب ہوش — تو کھولی اُن تھکی آنکھوں نے آغوش
محبّت سے بٹھا کر ساتھ اپنے — پھرا کر اُس پہ دونوں ہاتھ اپنے

اُسے اہلِ قلم کے دُکھ بتائے — جنہیں سُن کر کلیجہ مُنہ کو آئے
گِنے اُن ناشروں کے رات بھر نام — ادیبوں کے جو اکثر کھا گئے دام
بنیں گے جو کبھی دوزخ کا ایندھن — خرِ ابلیس کے دانتوں کا منجن
ادیبوں کی اسے "لسٹ" اک لکھوائی — زبانی یاد جو سب اُس سے کروائی
مرا گھر مرکزِ علم و ادب تھا — کہ "دنیائے کتب" کا میں قطب تھا
بہت ساری کتابیں اس کو لا دیں — ہزاروں علم کی شمعیں جلا دیں

تخلص اُس کا رکھا میں نے جنّت
تھی پہلی نظم اس کی "باغِ اُلفت"

حسینہ اور نو مہینے

اسی عالم میں گزرے نو مہینے — کھلایا اک نیا گُل زندگی نے
یہ اُلفت کی کہانی رنگ لائی — مرے ماحول سے وہ تنگ آئی
میں جب کہتا کہ "تو کتنی حسیں ہے"! — وہ کہتی "گھر میں اک پیسہ نہیں ہے"
میں اک دن باغ سے اک پھول لایا — نہ اس نے اس کو بالوں میں سجایا
لگی کہنے "اجی اس کو ہٹاؤ! — کبھی گوبھی کا بھی اک پھول لاؤ!"
چمن کے پھول کب تک لاؤ گے تم — مجھے کب تک چنے چبواؤ گے تم
بس اب اس شاعری سے باز آؤ — کسی دن پیٹ بھر کھانا کھلاؤ

فراموش کردند عشق

گئی کملا وہ صورت بھولی بھالی — "لگی ہے بھوک" وہ اک روز بولی
کہا "میں نے کہاں سے لاؤں پیسے! — کہا اس نے کہ "تم عاشق ہو کیسے"!
"یہ بہتر ہے کرو اب کوئی دھندا" — کہا میں نے "ہٹو، شاعر ہے بندہ"
کہا اس نے "نہ گر کچھ کھاؤں گی میں — کسی دن دیکھنا مر جاؤں گی میں
بتاؤ پھر کرو گے پیار کس سے؟ — یہ دو آنکھیں کرو گے چار کس سے؟
بہت دن تک رہی چلتی یہ تکرار — لڑے آپس میں دونوں بھلا کر پیار
سدا وہ شوخ ہاری میں نہ ہارا — "ادب" تھا زندگی سے مجھ کو پیارا

وہ دشمن ہو چکی تھی اب ادب کی
ادب کے نام تک سے جاں بلب تھی

شمعِ حزیں

وہ اک دن گھر میں آہیں بھر رہی تھی — کہ مستقبل سے شاید ڈر رہی تھی
ہوا جب ہنس کے میں کُٹیا میں داخل — تو اس کو دیکھ کر صدمے سے گھائل
کہا "یہ کس کا ماتم کر رہی ہو؟ — یہ ٹھنڈی آہیں کیوں تم بھر رہی ہو؟"
وہ بولی "اپنا ماتم کر رہی ہوں — میں دل کو خوگرِ غم کر رہی ہوں

نہ جانے کس جہاں میں کھو گئی ہیں　　　سہاگن ہو کے بیوہ ہو گئی ہیں

نہ ہے کچھ کھانے پینے کی ضرورت
نہ ہے کچھ روز جینے کی ضرورت"

مخدوش حالات

جو دیکھے میں نے یہ "مخدوش حالات"　　　دیا اس کو دلاسا تھام کر ہات
کہا اس سے کہ "یوں گھبرا نہ پیاری　　　نہ دل پر ڈال غم کا بوجھ بھاری
ہیں تھوڑے سے ابھی تکلیف کے دن　　　یہ دولت رہ نہیں سکتی مرے بن
یہ چیخیں مارتی آئے گی پیاری　　　یہ آ کر تھام لے گی تیری ساری
لگی ہے آج اگر افلاس کی چوٹ　　　تو کل تو ہی گنے گی رات دن نوٹ
بنی بیٹھی ہے کیوں غصے سی بندوق　　　میں بھر دوں گا ترے نوٹوں سے صندوق
لگانے کو ہوں میں دولت کے انبار　　　تجھے پہناؤں گا نولاکھ کا ہار
"رسالوں" میں بہت میں آ رہا ہوں　　　بہت مشہور ہوتا جا رہا ہوں
جونہی پھیلی ذرا بھی میری شہرت　　　تو جھٹ آ جائیگی اس گھر میں دولت

ابھی تو "کورٹ شپ" کا ہے زمانہ
نہیں ہے دور "خواب اپنا" سہانا

پڑوسن کی تباہ کاری

مری کٹیا سے تھوڑے فاصلے پر　　　مرے اک دوست شاعر کا بھی تھا گھر
بہ حالِ زار ہی رہتا تھا وہ بھی　　　ستم افلاس کے سہتا تھا وہ بھی
تھا اس کا نام عطاء اللہ سجّاد　　　تھا عرف اس کا لقاء اللہ برباد
مرے گھر آئی اک دن اس کی بیگم　　　بتایا میری "اُس" کو اپنا ہر غم
ادیبوں کے جو اس نے ذکر چھیڑے　　　مرے بخیے بھی ظالم نے ادھیڑے
کہا اُس سے "بہن اب صبر کرنا　　　یہی بہتر ہے دل پہ جبر کرنا
الٰہی توبہ! شاعر اور پیسہ؟　　　ہوا ہے کیا کبھی دنیا میں ایسا
یہ "جیجا رہے" سدا بھوکے مریں گے　　　گھروں میں اُن کے ہم آہیں بھریں گے
کہیں جو بھی اُسے سمجھو "تعلّی"　　　کہ جھوٹی ہے ہر اک اُن کی تسلّی"
بہت ہوتی رہیں آپس میں باتیں　　　یونہی گزرے کئی دن اور راتیں

میں اِن باتوں سے بالکل بے خبر تھا
ہوا اک دن وہی کچھ جس کا ڈر تھا

حسینہ اور ادیب

حسیں موسم تھا اور رُت تھی گلابی　　　ہوائیں مست تھیں جیسے شرابی

کبھی ہوتا ہے یہ محسوس مجھ کو
بھگائے جائے گا وہ "روس" تجھ کو

کسی "روس" سے ہائے میرے اللہ
نہ بندھوا دے کہیں وہ تیرا بِلّہ

"ندیمِ قاسمی" سو بار آیا
کبھی اُس نے بھی مجھ کو بینایا؟

میں ہو جاتی تھی شرما کے گلابی
وہ کیوں آخر مجھے کہتا تھا بھابی؟

تم آخر کس نشے میں ہو گئے غلین
سدا ذکرِ کتابِ "قرۃ العین"

ڈسے ہیں "آگ کے دریا" میں پھینکو نا
"سچ" ہوتے ہوئے ہیں اُس کو دیکھوں

نہ یاں آئے کنھیا لال "مردہ"
"کپور آباد" کا مشہور گردہ

جو ہنس ہنس پگڑیاں سب کی اچھالے
ذرا اب اپنی ٹوپی بھی سنبھالے

نہ "سمجھوتہ" ذکر میں چھوڑ دوں گی
میں اس کی تمکنت بھی توڑ دوں گی

مجھے اُس "تونسوی" کی فکر بھی ہے
لبوں پہ تیرے اس کا ذکر بھی ہے

عادم "ملکِ عدم" جاتا نہیں کیوں
یہ اب جینے سے باز آتا نہیں کیوں؟

میں تنگ آئی تری بد عہدیوں سے
یہ آئے دن کی "باقر مہدیوں" سے

ادب نے گر مجھے ٹی بی کرائی
کرے گا کیا "قتیل" "احمد شفائی"؟

کنویں میں کرشن چندر کو میں پھینکوں
ہے ڈوبا یا نہیں اوپر سے دیکھوں

زباں سے لفظ بیدی گر نکالا
بجا دوں گی میں فوراً تیرے بارہ

بتا مجھ کو ترا ساحر کہاں ہے
کہاں وہ دشمنِ شاہِ جہاں ہے؟

جلا دے پھاڑ دے دیوانِ فانی
"مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی"

تمنا، اللہ کے اب تک ابھی ہی ظہور
میں ڈالوں بھاڑ میں اس کا "نیا دور"

یہاں "نقش" اور "نقوش" آنے نہ پائیں
"خلیل" اور "شاہد احمد" بھی نہ آئیں

نہیں یہ شاہد احمد مجھ کو بھاتا
جو "سید" ہو کے ٹھمری بھی ہے گاتا

جو ہوتی کچھ شرافت اس میں باقی
رسالے کا نہ رکھتا نام "ساقی"

ادھر آ تجھ کو سیدھی رہ پہ ڈالوں
"خلیل الاعظمی" تیری نکالوں؟

بنتِ گراموفون

بہت سے اور بھی لیتی گئی نام
دیے سو سو ہر اک شاعر کو دشنام

ادیبوں کی بہت کی اس نے توہین
پکڑ کر سر میں بیٹھا ہو کے غمگین

بہت چیخ چیخ کے بعد اکتا گیا میں
جب اس بکواس سے تنگ آ گیا میں

یہ پھینکا میں نے فقرہ اس پہ کس کر
"گراموفون کی اولاد بس کر!"

چمک کر بول اٹھی وہ ماہ پارہ
"کہا کیا ہے؟ ذرا کہنا دوبارہ"

میں بولا بنتِ برقی ریڈیو ہے تو
گراموفون کی اولاد ہے تو

بجی ہے گر تو بجتی ہی رہے گی!
جو گرجی ہے تو گرجتی ہی رہے گی؟

راجہ مہدی علی خاں کی شاعری

جو دیکھا میرا اندازِ بیاں اور   تو بدلے اور بھی اُس کے حسیں طور
زباں میرے لیے بھی اُس نے کھولی   ذرا مٹکا کے آنکھیں مجھ سے بولی
"تو شاعر ہے؟ ہا ہا تو بھی ہے شاعر   تو پھر دُنیا کہے گی کس کو "ماٹر"؟
تری نظمیں ہیں کیا کچرے کا ہیں ڈھیر   یہ ایک آنے میں بک سکتی ہیں دو سیر
نہ ان میں کچھ "اُلٹ" ہے اور نہ کچھ "پھیر"   سمجھنے میں بھی کچھ "مشکل" نہیں دیر
نہ ان میں "سرگرانی" اور نہ "ابہام"   نہ ہے کچھ قوم ہی کے نام پیغام
"غریبی" ہے نہ ہے "مزدور" ان میں   "سیاست" ہے نہ کوہِ طور ان میں
کبھی لکھا کسی نے تجھ پہ مضموں   وزیر آغا؟ وزیر آغا ہے مجنوں
بہت سوں کو بنایا اُس نے اُلّو   گھڑے سے لاؤں پانی بھر کے چُلّو
جو ممکن ہو تو اُس میں ڈوب مرنا   مگر یہ شاعری ہرگز نہ کرنا

دیارِ شعر کے ادنیٰ سے فرہاد!
وزیر آغا تجھے کر دے گا برباد!

کچھ وزیر آغا کے بارے میں

میں اب تک سُن کے سب باتیں تھا خاموش   جو "ذکرِ یار" آیا آگیا جوش

کہا میں نے یہ سُن کر آہ ٹھنڈی   وزیر آغا کی مت کر بات رنڈی
وہ دنیائے شرافت کا خدا ہے   سمجھ مت یہ کہ وہ مجھ سے جُدا ہے
وہ چاہے تو تجھے کر دے ابھی ٹھیک   اسے سمجھوں تری شہ رگ کے نزدیک؟
اُسے مت فیض احمد فیض سمجھو   غضب سمجھو اُسے یا غیظ سمجھو
اُسے "چودہ حواسوں" پر ہے قابو   ہے سرگودھے کے جنگل میں وہ سادھو
وہ بیٹھا ہے وہاں خاموش چپ چاپ   اُسے "ڈسٹرب" کرنا ہے مہا پاپ
جگہ سے اپنی وہ ہلتا نہیں ہے   کسی ذی رُوح سے ملتا نہیں ہے
برس میں اک دفعہ وہ بولتا ہے   بڑی مشکل سے وہ لب کھولتا ہے
کہوں کیا میں "جلالی" پیر ہے وہ   تبر ہے، تیر ہے، شمشیر ہے وہ
ببر شیر اُس کی جب تکتے ہیں ہیبت   تو کر جاتے ہیں جھٹ ہاتھوں پہ بیعت
نہ شیطاں ڈر کے اس کے پاس جائے   اگر آئے دعائیں پڑھ کے آئے
بہ ظاہر ہے وہ بے حس اور بے جاں   بہ باطن ہے وہ اک خاموش طوفاں
سمندر دیکھ کر اس کو سمٹ جائیں   ہوائیں ڈر کے پیڑوں سے چمٹ جائیں
کبھی چیخے تو سو طوفان آ جائیں   اندھیرے چاند اور سورج پہ چھا جائیں
جھکی آنکھوں کو اشکوں میں بھگو کر   "بڑے دھاگے" میں "تاروں" کو پرو کر

بنا لیتا ہے اک تسبیح شب کو
عجب کچھ جنبشیں دیتا ہے لب کو
کوئی لمبی دعا وہ مانگتا ہے
خدا سے جانے کیا وہ مانگتا ہے
تو ڈر مجھ سے کہ ہے وہ پیر میرا
وہی خنجر ہے میرا، تیر میرا
نظر ڈالے جو تجھ پر خاک کر دے
ترا اک پل میں قصہ پاک کر دے

معرکۂ کفر و اسلام

وہ بولی "وہ اگر ہے دوست تیرا
عقیدہ اُٹھ گیا اس پر سے میرا
وہ یہ آغا اگر ایسا ہی ہوتا
تو پھر وہ دوست کیا تیرا ہی ہوتا"
میں بولا "پیر کو تکلیف کیوں دوں
ترے لئے میں خود ہی کیوں نہ لے لوں!"
یہ کہہ کر "ٹھہر جا اُلّو کی پٹھیا"
اُٹھالی میں نے ہاشم خاں کی لٹھیا
جھپٹ کر اس نے یہ لٹھیا گرادی
پلٹ کر لات اک میں نے جمادی
لپک کر اُس نے چھوڑے مجھ پہ "تکّے"
اِدھر سے بھی چلے کچھ "تیر تکّے"
فرائی پین لے وہ مجھ پہ دوڑی
جھپٹ کر تھام لی میں نے ہتھوڑی
مرے سینے پہ پھینکا اس نے "حقّہ"
"بزن" کہہ کر دیا اک میں نے "ٹُکّہ"
اُدھر سے آیا اک بیلن کا انڈا
اِدھر سے بھی "گنڈالی" اور ڈنڈا

اُدھر سے "کس کے" پھینکے اُس نے آلو
کیے بندے نے بھی "حاضر" کچالو
مروڑی اس پری نے میری اُنگلی
تو پیروں پر ٹکادی میں نے "مُنگلی"[1]

خوں ریز جنگ

بس اب دونوں نے رکھ دی طاق میں شرم
ہوئے ہم دونوں آہن کی طرح گرم
جنوں ایسا اُٹھا دونوں کے سر میں
غضب کا رن پڑا چھوٹے سے گھر میں
بڑی مُنہ زور ہاتھا پائیاں تھیں
بڑی خوں ریز جنگ آرائیاں تھیں
اُدھر پائل بجی چھم چھم چھما چھم
اِدھر "مُکّے" چلے دھم دھم دھما دھم
مرا مُنہ آگے بڑھ کے اُس نے نوچا
اِدھر سے ٹینٹوا میں نے دبوچا
جو میں نے ہاتھ زلفوں پہ بڑھایا
تو اس نے ہاتھ میرا کاٹ کھایا
چلی لٹھیا کھٹا کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ
گرے آنسو ٹپا ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ
کھنچیں زلفیں فٹا فٹ فٹ فٹا فٹ
پڑے تھپڑ پٹا پٹ پٹ پٹا پٹ

۱: مُنگلی پنجابی میں حمام دستے کو کہتے ہیں جس سے مسالہ وغیرہ کوٹا جاتا ہے۔

قیامت کی ہوئی وہ "مارا ماری"　　گیا تھم مرا اور اس کی ساری
اگرچہ اس کی چیخیں عرش پر تھیں　　مگر سب چوڑیاں اب فرش پر تھیں
کبھی جو گال تھے ہلکے گلابی　　ہوئے اب تھپڑوں سے وہ عنابی
جب اُس کو تھام کر چٹیا گھمایا　　بہت ہی اُس نے واویلا مچایا

چھٹیں اس لب سے پھلجھڑیاں وہ پیاری
کہ سکتہ ہو گیا شاعر پہ طاری

بہشت آ گیا

حسیناؤں نے جھانکا بام و در سے　　نہ باہر آ سکیں وہ میرے ڈر سے
مگر سُن کر مسلسل ہائے ہائے　　پڑوسی جب وہاں گھبرا کے آئے
کہا میں نے کہ بھاگو او دِوانو　　نہ کود و آگ میں اے مہربانو
یہ کیوں تکلیف تم کرتے ہو زنہار!　　نہیں جھگڑا یہ ہم دونوں کا ہے پیار
"پڑوسی تم ہو میرے شکوہ مجھے دو　　چلے جاؤ نہ اگر دُکھ مجھے دو
یہ کدو جیسے سر میں پھوڑ دوں گا　　یہ سارس جیسی ٹانگیں توڑ دوں گا
کرو فکر اپنی میرے گھر نہ آؤ　　بہشت اپنے محلے کو بناؤ

"بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد　　کسے را با کسے کارے نہ باشد"

مجھے دیکھا اُنھوں نے مُسکرا کر
معاً پھر چل دیے گردن جھکا کر

چار رکعت نماز فرض

اب اُس کافر کو اللہ یاد آیا　　مصلاّ اُس نے رو رو کر بچھایا
اگرچہ کتنی نمنتیں اُس دن بلا کی　　"نماز دو پہر" اُس نے ادا کی
اُٹھائے پھر دعا کو مرمریں ہاتھ　　بڑے ہی درد و کرب و رنج کے ساتھ
مری سب یاد کر کر کے جفائیں　　یہ مانگیں اُس نے رو رو کر دعائیں
"دعا یہ ہے اُٹھے ہیں مجھ پہ جو ہاتھ　　ہنو زُرے سے انھیں توڑے جگن ناتھ[1]
دعا یہ ہے مری اے ذاتِ باری　　چبا ڈالے اِسے قارئ بخاری
دعا یہ ہے مری اے میرے مالک　　اِسے لے جائے علم الدین سالک
دعا یہ مانگتی ہے تجھ سے بندی　　کہ دے بجالندھر اسے انور گوبندی
دعا یہ ہے کرے منہ اِس کا کالا　　وہی شہ نامۂ اسلام والا[2]

---

[1] جگن ناتھ آزاد　　[2] ابوالاثر حفیظ جالندھری

مجیدؔ امجد کا کتا اس کو کاٹے
یہ روروکر کے پیچھے اُس کے چاٹے
اسے یوسف ظفرؔ ستے ہیں پیٹے
اسے عابد علی عابدؔ گھسیٹے
اثرؔ صہبائی بھی آجائے جھٹ سے
ٹکائے ایک مُکّا اس کو کھٹ سے
"بُتِ گل فام را دُشنام گفتی"
یہ کہہ کر پیٹ دے ممتاز مفتی
دعا ہے اشک کے گھر جب کبھی جائے
وہاں وہ ہندوؤں سے اِس کو پٹوائے
سمت ہر کاش اسے ہندو بنالے
بنارس جا کے یہ چُٹیا بڑھالے
اسے پھینکے برائے "نیک نامی"
قطب مینار سے خوشتر گرامی
بنے یہ کوچواں ہانکے یہ ٹانگے
رشی پٹیالوی سے بھیک مانگے
نہ اس کو طاہرہ مخفی ہی چاہے
وہ آکر پیٹ جائے گا ہے گاہے
پکڑلیں جوشؔ و عرشؔ ملسیانی
کریں بناری پہ اتنی مہربانی
وہ آئیں بن کے ڈاکو منہ لپیٹے
اسے کھا جائیں دونوں باپ بیٹے
بلا سے گر وہ دیجی ٹیرین ہیں
حقیقت ہے کہ دونوں ایرین ہیں
دعا ہے اب اسے جلدی سے موت آئے
اسے پطرس بخاری آکے لے جائے
نہ بہرِ تعزیت ہی کوئی آئے
جنازہ اس کا خود شیطان اٹھائے

یہ کہتا ہے مرا ہر زخم تازہ
ہوں کتے ساتھ جب نکلے جنازہ
کرے شیطان ہی تجہیز و تکفین
پکارو اے فرشتو اہل کے آمین

میری مختصر سی دُعا

اٹھی جب وہ مصلے پر میں آیا
خدا کے سامنے سر کو جھکایا
دُعا کو موٹے موٹے ہاتھ اٹھائے
زمیں پر ایک دو آنسو گرائے
کہا مالک سے اے دُنیا کے والی
ترے در پر کھڑا ہے ایک سوالی
ترا دربار ہے دربارِ عالی
بھگا دینا نہ مجھ کو دے کے گالی
یہ تیری ہی شریعت میں لکھا ہے
کِسی کو گالیاں دینا بُرا ہے
میں ٹوٹے دل کا اِکتارہ بجا کر
تری رحمت کی کنڈی کھٹ کھٹا کر
نہ جنت مانگتا ہوں اور نہ حوریں
نہ کہتا ہوں کہ دے عربی کھجوریں
نہ سونا اور نہ چاندی مانگتا ہوں
میں تجھ سے التجا یہ کر رہا ہوں
کہ جو بندی ترے در پر کھڑی تھی
جو اپنی ناروا ضد پہ اَڑی تھی
ابھی مانگی ہیں جس نے سو دعائیں
سنائی ہیں تجھے جھوٹی صدائیں
تو اُس بندی کو اب ڈیجکٹ کر دے
دُعائیں اُس کی سب ریجکٹ کر دے

بہارِ آخر شد

وہ رشکِ ماہ آنگن میں کھڑی تھی   رواں آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی تھی
رومال اُس کو دیا اک میں نے لاکر   دیا پھینک اُس نے جو غصے میں آکر
یکایک ہو گئی چپ روتے روتے   کہ جیسے چونک اٹھی ہو سوتے سوتے
سب آنسو آستیں سے پونچھ ڈالے   جو باقی تھے وہ آنکھوں میں سنبھالے
دیے پانی کے چھینٹے مُنہ پہ دو چار   کیے خشک اپنے بھیگے بھیگے رخسار
لیے ہاتھوں میں کاجل اور سلائی   وہ پیشِ آئینہ اٹھلا کے آئی
دیے آنکھوں میں جب کاجل کے ڈھاسے   چمک اُٹھے اُن آنکھوں کے ستارے
لگائے مُنہ پہ پیت پوڈر کے دو چار   لپ اسٹک سے بنایا لب کو گلنار
سیہ زلفوں کی بدلی کو سنوارا   دمک اٹھی وہ پھر سے ماہ پارا
وہ اک زخمی پری بن کے اٹھی تھی   "قیامت" سامنے میرے کھڑی تھی
ہزاروں بجلیاں برسا رہی تھی   نگاہوں کو مری تڑپا رہی تھی
یہ جی چاہا کہ سینے سے لگا لوں   اسے بھر دل کی دھڑکن میں بسا لوں
مری نیت کو اک دم پا گئی وہ   مرے نزدیک ہنس کر آ گئی وہ
یکایک عشق سے بے تاب ہو کر   گری جھٹ سے مرے قدموں پہ رو کر

یہ بولی "رحم کیجے مجھ پہ سرکار   جہاں فانی، نہیں فانی مرا پیار
میں اُلجھی آپ سے بس ہو گئی بھول   ہوا جو کچھ بھی اس پہ ڈالیے دھول
نہ چاہوں آپ کو کیا ویٹ یا ہوں؟   زنِ ہندی ہوں، فخرِ ایشیا ہوں
ملا لیجے نگاہیں مسکرا کر   بنا لیجے مجھے اپنا اُٹھا کر!"
نشے میں جیت کے میں مسکرایا   اُسے قدموں سے اپنے جھٹ اُٹھایا
وہ بولی "دیکھیے کیکر پہ بلبل   کہاں سے آ گئی ہے یہ بنا گل؟"
جو بلبل دیکھنے کو سر گھمایا   میں چیخا "مر گیا رے میں خدایا"
مرے معصوم سر پہ ایک ڈنڈا
لگا یوں تھا، کہ میں اک دم تھا ٹھنڈا

آخری منظر

وہ بھاگی جھٹ سے اب کٹیا سے باہر   نگاہِ قہر ڈالی اک پلٹ کر
لگی کہنے کہ "بس اب تجھ پہ لعنت   گئی چولھے میں سب تیری محبت"
یہ سن لے میں تجھے ٹھکرا رہی ہوں   میں دولت خاں کے گھر اب جا رہی ہوں
تو اِس کٹیا میں بیٹھا شاعری کر   میں جینے جا رہی ہوں، تو یہیں مر
میں بولا "چاہے ناتے توڑتی جا   یہ سر ٹوٹا ہوا تو جوڑتی جا"

تو روئے جا رہی ہے اپنے دُکھڑے   نہ جانے ہو گیا یہ کتنے "ٹکڑے"
وہ کہہ کہہ "پھیر لو" مجھ سے یہ بولی   "ترے پاس اب مری آتی ہے جُوتی"
پٹخ کر پیر وہ غصّے سے چل دی   میں پیلا پڑ گیا جیسے کہ ہلدی
گرا سجدے میں اور بولا خدایا   "یہ کیسا دن مجھے تُو نے دکھایا؟
"زنِ خود رفتہ" باز آید کہ ناید   بعجز و نیاز آید کہ ناید

زنانِ بے شمار اندر جہان اند
"زنِ بندہ نواز" آید کہ ناید

رند کے رند رہے

خانہ بہ مہمان گذاشت

گھر میں آیا ہے جو مہمان نہیں جائے گا
لے کے جائے گا مری جان نہیں جائے گا

رہ پڑا ہے یہ مرے گھر میں ہمیشہ کے لیے
جب تلک جسم میں ہے جان نہیں جائے گا

گالیاں دل میں ہزاروں اسے دی ہیں لیکن
اس کو ہوتا نہیں عرفان نہیں جائے گا

میں وہ یعقوب ہوں جو اس سے بچھڑتا چاہے
یہ وہ یوسف ہے جو کنعاں نہیں جائے گا

دانے دانے پہ خدا نے ہے لکھا اس کا نام
گھر میں جب تک ہے یہ سامان نہیں جائے گا

ہم کمینے ہیں تو یہ کیوں ہے کمینہ یارب؟
اب تو یہ تا حدِّ امکان نہیں جائے گا

اس کے والد کا یہ گھر ہے نہیں رہ جانِ بہار
یہ رہے گا علی الاعلان نہیں جائے گا

پاؤں نازک ہیں ترے ان کو نہ غصّے میں پٹک
یہ بتِ بے حس و بے جان نہیں جائے گا

اس پہ آئے ہوئے غصّے کو نہ بچوں پہ نکال
پٹ کے ہو جائیں گے ہلکان نہیں جائے گا

"آیت الکرسی" نہ پڑھ اس پہ نہ "لاحول" ہی پھونک
اس کا اللہ ہے نگہبان نہیں جائے گا

آ جا رو رو کے گلے اس کے ملیں ہم دونوں
میرا ذمہ تیرا ایمان نہیں جائے گا

کئی بار اس نے کنکھیوں سے تجھے دیکھا ہے
دل میں لے کر ترے ارمان نہیں جائے گا

اے مری سروِ خراماں اے مری حورِ جمال
تری جنّت سے یہ غلمان نہیں جائے گا

ہائے بے چارے کو تو کتنی پسند آئی ہے
اب تو دیدیگا یہیں جان نہیں جائے گا

دینے والا ہے یہ شاید تجھے شادی کا پیام
ترے در سے کسی عنوان نہیں جائے گا

سنگدل پیٹ نہ یوں مجھ کو میں سچ کہتا ہوں
گھر چلا جائے گا "دربان" نہیں جائے گا

نوکروں سے ابھی بندھواتا ہوں سامان ترا
یہ یونہی بے سروسامان نہیں جائے گا

میں ہی چل دیتا ہوں گھر سے اسے تکلیف نہ ہو
چھوڑ کر یہ ترا "دامان" نہیں جائے گا

دالِ خالد و عرفان چلا جائے گا
"وارثِ خالد و عرفان" نہیں جائے گا

رو نہیں جانِ ادا ہونٹوں پہ لے آ مسکان
میں بھی اس گھر میں کبھی آؤں گا بنکر مہمان

ایک اور مہمان

بن کے آیا ہوں میں مہمان نہیں جاؤں گا
سب کو کر دوں گا پریشان نہیں جاؤں گا
بیٹھ کر چین سے پھونکوں گا تمہارے سگریٹ
پک رہے ہیں ابھی پکوان نہیں جاؤں گا
ذبح ہوتی ہوئی مرغی کی صدا آتی ہے
گھر میں دعوت کا ہے سامان نہیں جاؤں گا
دوں گا میں مسجد مہمان نوازی میں اذاں
میں ہوں اک سچا مسلمان نہیں جاؤں گا

دل پہ میں جبر کیے صبر کیے بیٹھا ہوں
لے کے میں بھوک کا طوفان نہیں جاؤں گا
خشمگیں نظروں سے آخر مرا کیا بگڑے گا
تم کو ہو جائے گا خفقان نہیں جاؤں گا
کھا رہا ہوں میں نگاہوں کے ہزاروں دھکے
پھر بھی ہونٹوں پہ ہے مسکان نہیں جاؤں گا
کیوں پکائی ہیں یہ سب چیزیں مزیدار لذیذ
میرا ہر چیز میں ہے دھیان نہیں جاؤں گا
مجھ کو معلوم نہ تھا اتنے کمینے ہو تم
جاؤ جاؤ علی الاعلان نہیں جاؤں گا
اتنا کھاؤں گا کہ آجائے گا غش تم سب کو
تم کو کر دوں گا میں ہلکان نہیں جاؤں گا
اے رذیلو! مجھے جانے کے اشارے نہ کرو
جب تلک جسم میں ہے جان نہیں جاؤں گا

پونچھ لو آنکھوں میں آتے ہوئے ہر آنسو کو

میں تو اب تا حدِ امکان نہیں جاؤں گا

خود ہی کہہ دو کہ "اجی چاہیئے کھانا کھاکے"

ورنہ میں خود ہی مری جان نہیں جاؤں گا

"مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"

راجندر بیدی اور چور

(۱)

رات تاریک ہے اور ویراں سڑک — اجنبی کس لیے تم یہاں ہو کھڑے؟

پھر کھڑے اس طرح ہو کہ ہر اک نظر — بے شبہ تم پہ مشکوک ہو کر پڑے

بال بکھرے ہوئے ہیں نگاہیں حزیں — سچ بتاؤ مجھے کیوں پریشان ہو؟

اپنے تھوڑے سے غم دوست مجھ کو بھی دو — مجھ سے تم کچھ چھپاتے مری جان ہو

(۲)

میں نے سن لی ہے سب داستانِ الم — ان ستاروں کی چھاؤں میں دل تھام کر

قصۂ مختصر یہ کہ تم چور ہو — اس مکاں پر ہے شاید تمہاری نظر

اس مکاں کے مکیں سے کئی سال سے — تھوڑی تھوڑی مری جان پہچان ہے
جب یہ مفلس تھا کہتی تھی دنیا سبھی — اے خدا کتنا اچھا یہ انسان ہے
دولت آتے ہی سب سے اکڑنے لگا — پھر گئے اس کے دن بڑھ گئی اس کی "ہیں"
لوٹ کر اس کا گھر اس کا مال اس کا دھن — خاک میں ہم ملا دیں گے آج اس کی "ٹیں"
کہہ کے بسم اللہ اب ساتھ آؤ میرے — توڑ دیں اس علی گڑھ کے تالے کو ہم
جو بھی چاہو گے اس گھر سے مل جائے گا — ہے یقیں مجھ کو اس کا خدا کی قسم
کھل گیا ایک جھٹکے میں ٹھیرو ذرا — ایک لمحے میں بجلی جلاتا ہوں میں
پیچھے پیچھے سے اس گھر کے واقف ہیں ہم — "مال اصلی کہاں ہے؟ بتاتا ہوں میں"
اندر آجاؤ چپکے سے اے اجنبی — ہال میں ہر طرف روشنی ہو گئی
"صاحب خانہ" جانے کدھر مر گیا — آج تقدیر کم بخت کی سو گئی

(۴)

بھوک تم کو لگی ہے تو آؤ ادھر — بسکٹوں کا یہ ڈبا ہے یہ جام ہے
دیکھو گھبراؤ مت خوب کھاؤ پیو — آج کی رات اس گھر کا نیلام ہے
"صاحب خانہ" کی میز پر آم ہیں — یہ چھری بھی ہے کھاؤ انہیں کاٹ کر
کھیر کی ڈش ہے یہ ساتھ چمچہ نہیں — صاف کر دو زباں سے اسے چاٹ کر

بس میاں کھا چکے؟ اچھا اچھا چلو — لے لیں اس گھر کی اب ہم تلاشی ذرا
سارے کمروں میں چاروں طرف گھوم کر — آج کم کر لیں فکرِ معاشی ذرا

(۵)

لے لو یے لو جی پچیس سو نقد ہیں — اس کی بیوی نے شاید چھپائے تھے یہ
اس کی جیبوں سے وقتاً فوقتاً کبھی — اس بچاری نے شاید اڑائے تھے یہ
گیارہ تولے کا ہے غالباً ہار یہ — تین تولے کی شاید ہیں یہ بالیاں
کھولو الماریاں مجھ کو معلوم ہے — ان میں چاندی کی ہیں نو عدد تھالیاں
یہ زمرّد کے جھمکے، یہ ہیرے کے سیٹ — ننّھی ننّھی یہ سونے کی انگوٹھیاں بھی ہیں
جب انہیں جیب میں رکھ کے چل دوگے تم — پھر نہ باقی رہے گی بچارے کی "ہیں"
گرم یہ سوٹ ہاں ہاں چرا لو انہیں — سردیوں میں تمہارے یہ کام آئیں گے
جسم پر گر تمہارے نہ یہ فٹ ہوئے — اچھی قیمت پہ بیشک یہ بک جائیں گے
کسی ایران کے باغ ہی کی طرح — کس قدر خوبصورت یہ قالین ہے
کر کے تہہ اس کو بوری میں رکھ لو ذرا — نہ چرانا اسے اس کی توہین ہے

(۶)

بھر چکی ہیں "اثاث" یہ سب بوریاں — کیا یہ چاروں کی چاروں اٹھالوگے تم؟

اتنا ہی خوش کرو گے مجھے آج تم حسرتیں جتنی دل کی نکالو گے تم
اور کچھ چاہیے ؟ اچھا اب جاؤ گے؟ تم کو جلدی ہے پر مجھ کو جلدی نہیں
میں تمہیں چھوڑ آؤں گا کچھ دور تک تم ہو محفوظ اے دوست رکھو یقیں
مجھ کو حصہ نہ دو بھاگ جاؤ بس اب دیکھ لے گا کوئی ہو رہی ہے سحر
ہو سکے گر تو اب جاتے جاتے ذرا مسکرا کر مجھے دیکھ لو اک نظر
نہیں جذبات کی رَو میں اتنا بہو فکر میری کرو تم نہ اے مہرباں
تم کو کافی ہے جو کچھ تمہیں مل گیا مجھ کو کافی ہے جو کچھ ہے باقی یہاں
رات تاریک تھی اور ویراں سڑک میں کھڑا دیر تک اس کو تکتا رہا
"تاروں کی چھاؤں میں دیر تک میرا دل میرے سینے میں دھک دھک دھڑکتا رہا
کامیابی پہ اپنی بہت خوش تھا" وہ اس حقیقت سے بے چارہ انجان تھا
مجھ سے اٹھوا کے جو اس نے سر پر رکھا سب کا سب میرے ہی گھر کا سامان تھا

حسابِ دشمناں و دل

(۱)

"سلاماں لیکم! قسم خدا کی بہت ہی عمر آپ کی بڑی ہے"

(صبح صبح توبہ توبہ توبہ نگاہ کس شوم سے لڑی ہے)

"کھڑی ہیں کیوں آپ؟ بیٹھئے نا۔ گئے ہیں شاید وہ ڈاکخانے"

(نہیں وہ گھر میں تو اب کرے گی تو جلد جانے کے سو بہانے)

"غضب کا حسن آج آپ پر ہے بھجوں میں کیا چند آہیں ٹھنڈی"

(لگا کے دنبالہ دار کاجل تو ہو بہو لگ رہی ہے رنڈی)

"پئیں گی کیا آپ روح افزا؟ نہیں! تو پھر کیا پئیں گی چائے؟"

(ترے خصم کا یہ گھر ہے شاید کہ جب بھی جی چاہا کھسک آئے)

"زبیدہ جلدی سے چائے لاؤ، یہ دیکھو تشریف لائیں آپا"

(تمہاری باجی کی سوت آئی ہے، اس کا آکر کرو سیاپا)

"مشین کیا چیز؟ میں تو حاضر کروں اگر آپ جاں بھی مانگیں"

(مشین کیا تیرے باپ کی ہے؟ میں پیر دوں تیری دونوں مانگیں)

"وہ چھ بجے شام کل ملیں گے! جی چھ بجے آپ آسکیں گی"

(دوپٹہ سرکا کے کل ہی آپ اُن کو اپنے نخرے دکھا سکیں گی)

"سور کی بچی! حرام زادی! چھنال!" "جی کون؟" "بی رضیہ!"

(قسم خدا کی میں ایک دن تنگ آکے نبٹوں کی سب قضیہ)

"مگر رضیہ تو نام میرا نہیں جی وہ ایک دوسری ہے"

(بہت دنوں سے چھنال میرے میاں کے پیچھے پڑی ہوئی ہے)

"زبیدہ تو یہ کہاں گئیں پھر، ذرا مری جان، ادھر تو آنا"

(رضیہ آپا کو اپنے پیا تو یہ آن کر وہ غزل سنانا)

"زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا ——!

کنواریوں کا بیا ہتا مردوں کے ساتھ چھپ چھپ کے پیار ہوگا"

———

رند کے رند رہے

ایے خدا آج تجھ سے جو کہتا ہوں میں
اس کا مطلب میں بالکل نہیں جانتا

مجھ کو آتی نہیں ہے تری یہ زباں
اپنا یہ عجز میں کب نہیں مانتا

جلدی جلدی وضو کر کے آیا ہوں میں
سر پہ ٹوپی ہے اور ہاتھ سینے پہ ہیں

اور خیالات کے طائرِ خفتہ پرِ
محوِ پرواز مکے مدینے پہ ہیں

اچھی اچھی ہی باتیں یہ ہوں گی کوئی
گو سمجھ میں مری کچھ بھی آیا نہیں

قوم نے آیتیں تو سکھا دیں مگر
ان کا مطلب کسی نے بتایا نہیں

خالقِ دو جہاں! معذرت میری سُن!
اس لیے پڑھ رہا ہوں نماز قضا

رات کو دیر سے مجھ کو چھٹی ملی
نصف شب سے نہ پہلے میں گھر آسکا

صبح آئی تھی بیوی جگانے مجھے
پر اسے مجھ پہ کچھ رحم سا آ گیا

بخش دینا اسے وہ بڑی نیک ہے
اس بچاری کو شیطان بہکا گیا

دیکھ پھر میں نے "اللہ اکبر" کہا
ہاتھ گھٹنوں پہ رکھتے ہی سر جھک گیا!

جب کہا میری بیوی نے "جلدی پڑھو"!
تو خیالات کا سلسلہ رک گیا

وہ بھی سچی ہے اے رازق دو جہاں!
اس کو ڈر ہے کہ میں لیٹ ہو جاؤں گا

نوکری لیٹ ہونے سے گر چھٹ گئی
پھر غریبی کی فکروں میں کھو جاؤں گا

سر دپڑ جائے گا پھر سے چولہا مرا
میرے معصوم سب بھوکوں مر جائیں گے

تو نے تھوڑا سا بھی گر تغافل کیا
رازق دو جہاں وہ کدھر جائیں گے

ان کے آگے بھی سر کو جھکاتا ہوں میں
تیری دنیا میں ہیں اور بھی کچھ خدا

اے خدا رحم کر تو مرے حال پہ
میں نہ ان سے جدا اور نہ تجھ سے جدا

This book has been ended here

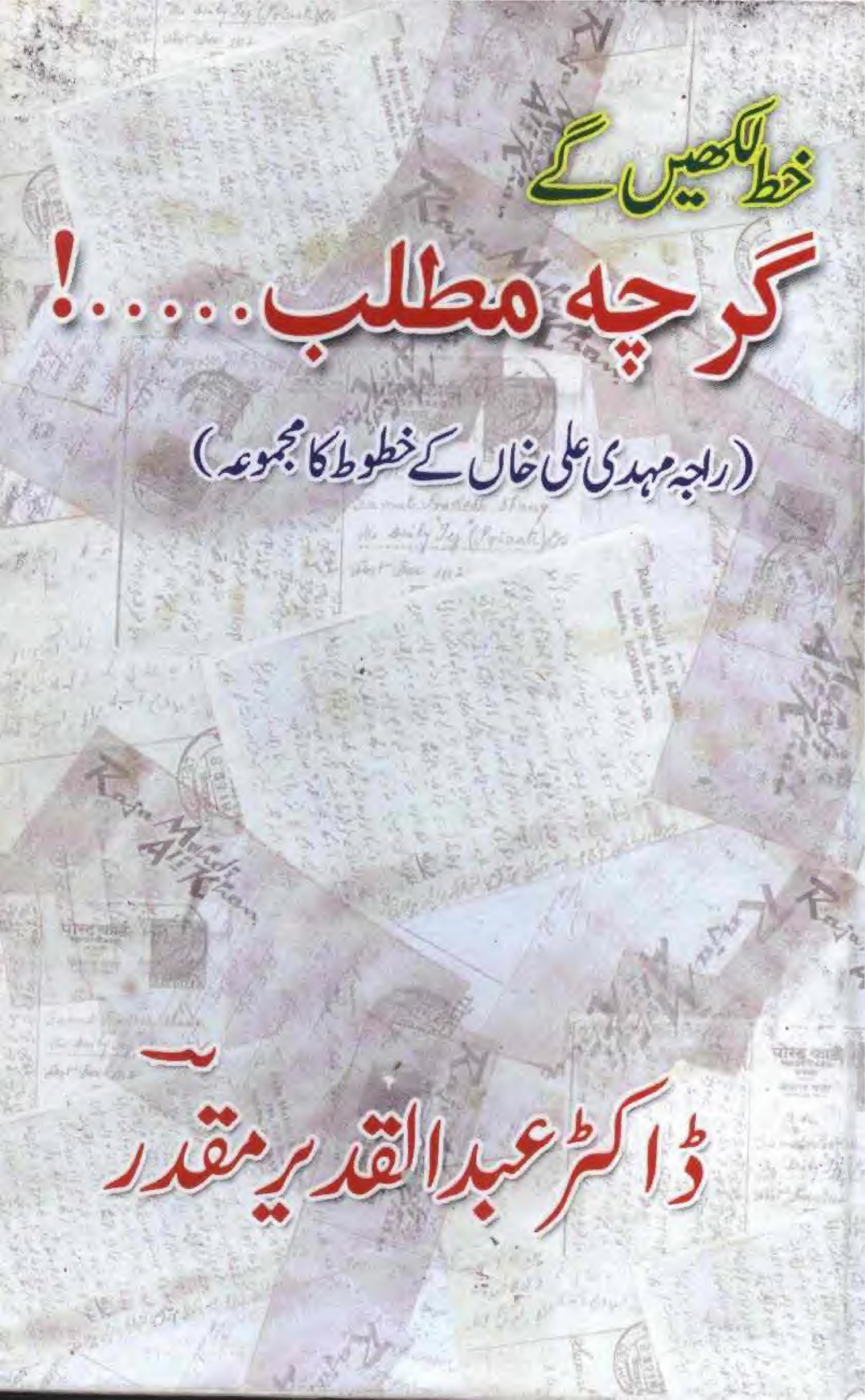

خط لکھیں گے

گرچہ مطلب....!

(راجہ مہدی علی خاں کے خطوط کا مجموعہ)

سے

ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر

راجہ مہدی علی خاں
کی
ادبی خدمات

ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر

Abdul Qadeer
Muqadar,
Dakkan

کچھ راجہ مہدی علی خاں کے بارے میں

۲۳ رستمبر ۱۹۱۵ء کو راجہ مہدی علی خاں وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی بیگم طاہرہ سلطانہ مخفی کے بیان کے مطابق وہ اپنے آبائی گاؤں کرم آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے نانا کرم الٰہی بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اور انہی کے نام سے یہ گاؤں ''کرم آباد'' موسوم ہے۔ نریش کمار شاد کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں راجہ مہدی علی خاں نے اپنے لڑکپن کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''مشن اسکول وزیر آباد ضلع گوجرانوالا کے ماسٹروں سے
پٹ پٹا کر اور پونے دو میل پیدل چل کر اپنے گاؤں میں
واپس آرہے تھے کہ گاؤں کی قریبی سڑک پر میری پھوپی
زاد بہن دوڑتی ہانپتی کانپتی آئی اور کہنے لگی۔ آج
آپ لوگوں کی خیر نہیں، دونوں ماموں جان چھڑیاں لے
کر آپ کے خیر مقدم کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔''

راجہ مہدی علی خاں کا تعلق علمی گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد عنایت اللہ خاں نہ صرف شعر فہم تھے بلکہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ والدہ حبیبہ خانم بہت ہی مقبول صاحب دیوان شاعرتھیں۔ ان کا قلمی نام ح۔ب صاحبہ تھا۔ علامہ اقبالؔ نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ ''مشرقی خواتین میں یہ ایک مقبول شاعرہ ہے۔'' ''نوائے حرم'' ان کا مجموعہ کلام کافی مشہور ہوا۔ ان کے چار بھائی اور ایک بہن، ز۔ب۔ صاحبہ مشہور افسانہ نگار تھیں۔ اس طرح راجہ مہدی علی خاں کے ایک ماموں مولانا ظفر علی خاں شعلہ بیاں خطیب، بلند پایہ شاعر اور ایک اعلیٰ درجہ کے مسلمہ ادیب و مترجم تھے۔ وہ ایک سیاستداں اور مجاہد آزادی تھے۔ لاہور اور پنجاب بلکہ پورے ملک میں مدت تک ان کا طوطی بولتا رہا۔ روزنامہ ''زمیندار'' کے ایڈیٹر اور طنز و مزاح کے نامور ادیب شاعر تھے۔ وہ نہایت ہی بے باکی کیساتھ انگریزی حکومت پر طنز کیا کرتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں متعدد بار قید و بند کے مصائب بھی جھیلے، اخبار کی ضمانتیں بھی ضبط ہوئیں۔ زمیندار کے علاوہ وہ دکن ریویو اور ستارہ صبح کے بھی ایڈیٹر تھے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں اپنے گاؤں کرم آباد میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن ڈی۔ لٹ کے ایک خط میں راجہ صاحب لکھتے ہیں:''

''مولانا ظفر علی خاں مرحوم ایڈیٹر اور مالک اخبار ''زمیندار'' لاہور، حامد علی خاں سابق ایڈیٹر ''ہمایوں'' لاہور، حمید احمد خاں صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور تینوں میرے ماموں ہیں جنہیں انداز بیاں اور'' کے ریویو

کے سلسلہ میں'' ''نصرت'' (ماہنامہ پاکستان) والوں نے میرا بھائی لکھا ہے۔ حمید احمد خاں پندرہ سال سے غالبؔ پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو شاید اب تک پوری نہیں ہوئی۔ محترمہ ح۔ب صاحبہ میری والدہ ہے۔ (والد صاحب دو برس ہوئے پاکستان میں انتقال کر گئے) اُن کی نظموں کا مجموعہ ''نوائے حرم'' شائع ہو چکا ہے۔ دس پندرہ برس سے کہنا اور لکھنا بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان کی شاعری کے بہت ثناخواں تھے۔ محترمہ ز۔ب صاحبہ کے افسانوں نے آج سے بیس پچیس سال پہلے دنیائے ادب میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ وہ میری خالہ ہیں۔ اور پاکستان میں ہیں۔ جب میں ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' ایڈٹ کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر شاید بیس برس ہوگی۔''

راجہ مہدی علی خاں کے ایک بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی عثمان علی خاں پہلے ریلوے میں ملازم تھے پھر انہوں نے اپنی ملازمت ترک کر کے ''مخزن'' جاری کیا جو اپنے وقت کا مقبول پرچہ تھا۔ راجہ صاحب کی بڑی بہن عذرا خانم بھی شعر کہتی تھیں ان کے شوہر ایک کامیاب بزنسمین تھے۔ سلمیٰ خانم خالدہ خانم اور زبیدہ خانم جو

عثمان علی خاں کے بعد پیدا ہوئیں۔ سبھی کو علمی شغف تھا اور سبھی شعر فہم اور شاعر تھیں۔ اس طرح راجہ صاحب کا ننھیال اور دادیہال دونوں گھرانے تعلیم یافتہ علم وادب کے رسیا تھے۔ جس میں راجہ کی پرورش ہوئی۔ خود ان کے بیان کے مطابق ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول وزیرآباد میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔ اے کیا۔ زمانہ طالب علمی سے صحافت سے لگاؤ رہا اور ''پھول'' نامی رسالے میں انگریزی اور دیگر زبانوں کی کہانیاں اور مضامین کے ترجمے جو راجہ صاحب لکھا کرتے تھے شائع ہوا کرتے اور شعر گوئی ورثہ میں پائی تھی لڑکپن ہی سے شعر کہا کرتے تھے خود اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

> ''ان ستم ظریف بزرگوں نے درختوں کے وہ چار چار پانچ پانچ ٹہنے رسیوں کی مدد سے ہماری کمر کے ساتھ باندھ کر ہمیں ہندوستان کا نمائندہ پرندہ یعنی مور بنایا اور حکم دیا کہ دوڑ دوڑ کر آنگن کے گیارہ راونڈ لگاؤ۔ جب ہم نے عورتوں اور بچوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھکر ذرا پس و پیش کی تو لاتوں، مکوں اور گالیوں سے ہماری تواضع شروع ہوگئی اور مجبوراً ہمیں حکم کی تعمیل کرنی پڑی.......لیکن میں نے سوچا......راجہ مہدی علی خاں اپنی خفت مٹانے اور بے عزتی پر صبر کرو۔ آنسو نوش کر جاؤ ہر ٹکے پر باہر چھڑی کے وار پر فاروق علی خاں (پھوپی زاد بھائی) کی طرح

> ''ہائے میں مرا'' کہنے کی بجائے ناچو اور قہقہے لگاؤ۔ چنانچہ میں نے خوب قہقہے لگائے اور '' آنگن میں چور ناچیں'' گاتا رہا........اس عمر میں بھی میں نے مور اور چور کے قوافی کی پابندی سے اپنے فطری شاعر ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔''

اس طرح راجہ صاحب کی پہلی نظم اسی حادثہ کا نتیجہ تھی۔ وہ بچپن میں بہت شریر اور نٹ کھٹ تھے۔ ان کی شرارتوں میں بھی مزاح کا پہلو ہوا کرتا تھا۔ بچپن کی اس پٹائی کے بعد جو نظم ''بزرگوں کے مظالم'' کی صورت میں وجود میں آئی۔

''بچوں پہ ظلم کرلو قیامت قریب ہے
اب حد سے تم گزر لو قیامت قریب ہے
اک دن فرشتے تم کو بھی پیٹینگے گرز سے
یہ بات یاد کر لو قیامت قریب ہے
ہم کو لگے گی بھوک تو تربوز کھائیں گے
تم جاؤ بھوکوں مر لو قیامت قریب ہے

اور اسی طرح نظم کے آخر میں میری شاعری قدرے آزاد ہوگئی تھی اور اسے میں نے کچھ اس طرح ختم کیا تھا۔

یوں پیٹ پیٹ ہم کو بنایا ہے تم نے مور

یوں آسماں کے نیچے مچایا ہے تم نے شور
دنیا کے سامنے کہا ہم کو حرام خور.....!
تربوز کھائیں گے اجی ہم تو نہیں ہیں چور
پیروں پہ سر کو دھر لو قیامت قریب ہے

راجہ مہدی علی خاں نے انی نظموں میں کوئی تخلص استعمال نہیں کیا۔شاذ ونادر ہی اپنا پورا نام استعمال کیا۔ بیشتر نظمیں بغیر تخلص ہیں۔ جب نریش کمار شاؔد نے راجہ صاحب سے ان کے قلمی نام ''تخلص'' سے متعلق استفسار کیا تو کہنے لگے کہ

''میں نے اپنے لئے کوئی تخلص کیوں نہیں تجویز کیا؟ کون کہتا ہے کہ نہیں کیا؟ بچپن میں رسؔوا کیا تھا۔لیکن بزرگ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو غنڈا ہے۔ان کے طنزیہ ومزاحیہ فقروں سے جب میرا دل زخمی ہونے لگا تو میں نے گھائل تخلص رکھ لیا۔ والد صاحب جو خود بھی بغیر تخلص کے شاعر تھے یہ کہہ کر میرے اس نئے تخلص کی کھلی اُڑانے لگے۔

''راجہ جی گھائل ہو گئے ہیں انہیں ہسپتال پہنچانا چاہیئے۔''

میں تنگ آکر ایک دن مسرور تخلص رکھ لیا۔لیکن اسی دن ایک بزرگ نے مجھے پیٹ ڈالا۔اور میں نے غصہ میں آکر اپنا تخلص ہی غمگین رکھ لیا دو مہینے تک میرا تخلص غمگین

ہی رہا۔ایک دن دوستوں نے مذاق اُڑایا کہ جس شاعر کا تخلص ہی غمگین ہو وہ مزاحیہ نظمیں کیسے لکھ سکتا ہے۔غصہ میں آکر میں نے قسم کھائی کہ اب کوئی تخلص نہیں رکھوں گا۔ جب سے بے تخلص ہی چلا آرہا ہوں۔''

یوں تو راجہ مہدی علی خاں کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔وہ ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' ایڈٹ کیا کرتے تھے۔اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔لیکن شاعری انہوں نے آٹھ سال ہی کی عمر سے شروع کردی تھی۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے موسومہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

''جی ہاں! میں وہی راجہ مہدی علی خاں ہوں جو کسی زمانے میں ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' ایڈٹ کرتا تھا۔پرچوں میں میرا نام نہیں تھا۔لیکن ایڈٹ میں ہی کرتا تھا۔میں نے آٹھ سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے۔''

ان کے علاوہ راجہ صاحب زمیندار اور نیرنگ خیال سے بھی وابستہ رہے۔وہ ایک کامیاب مترجم تھے۔مختلف زبانوں کے دلچسپ افسانے اُردو میں منتقل کرنے میں راجہ صاحب کی نمایاں خدمات ہیں۔ان دنوں ان کے منتخب اور ترجمہ کئے گئے افسانوں کی بڑی ستائش اور پذیرائی ہوا کرتی تھی اور وہ اسطرح کافی مقبول ہو چکے تھے۔''نیرنگ خیال'' لاہور نہایت معیاری پرچہ تھا اس کے ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسین تھے۔دہلی کے نامور جرنلسٹ

ست پرکاش شوق کے موسومہ خط میں وہ لکھتے ہیں۔

"آج کل" کے ادارے میں جو لوگ ہیں ان سے غیر
مطبوعہ کلام یا مضمون "نیرنگ خیال" کے چالیس سالہ نمبر
کے لئے حاصل کر سکتے ہیں۔ میری طرف سے سلام اور
درخواست کیجیئے کہ وہ اس عظیم الشان نمبر کے لئے کچھ
ضرور دیں .... یہ تکلیف اس لئے دے رہا ہوں کہ
آپ دہلی میں ہیں .... اس کیلیے میں بھی ممنون رہونگا
اور راجہ مہدی علی خاں صاحب بھی اس سے راجہ صاحب
کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں راجہ مہدی علی خاں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کیا اور بچوں کے پروگرام کے علاوہ فوجی بھائیوں کے پروگرام ترتیب دیا کرتے تھے۔ یہیں ان کی ملاقات ن۔م۔ راشد، میراجی اور اختر الایمان سے ہوئی۔ ن۔م۔ راشد شعبہ کے انچارج تھے۔ اختر الایمان نے بتایا۔

"ریڈیو پر میں اور بہت سے کاموں کے علاوہ لسنر
Listener "آواز" جس میں ریڈیو کے پروگرام چھپتے
تھے۔ اس کے لئے ترجمہ اُردو میں کرنا بھی میرے کاموں
میں سے ایک کام تھا۔ وہیں میری ملاقات راجہ سے ہوئی۔

وہ میرے ذاتی دوست تھے۔ وہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی آگئے
تھے اور میں اس کے بعد بمبئی آیا۔"

۱۹۴۶ء میں سعادت حسن منٹو کی دعوت پر وہ بمبئی چلے آئے۔ اور "فلمستان لمیٹیڈ" فلم کمپنی میں بحیثیت ڈائیلاگ رائیٹر کام شروع کیا۔ طبیعت میں چونکہ شاعرانہ رنگ تھا وہ زیادہ دنوں اس کام سے جڑے نہ رہ سکے۔ پھر انہوں نے فلموں کے لئے گیت لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۶۴ء میں فلم "آٹھ دن" کیلیے پہلی بار انہوں نے گیت لکھے۔ اور اسی فلم میں چار نئے چہرے بطور ایکٹرز پیش کیئے گئے تھے ان میں راجہ مہدی علی خاں، سعادت حسن منٹو، محسن عبداللہ اور اوپندر ناتھ اشکؔ اس فلم میں راجہ صاحب نے ہیرو اشوک کمار کے بہنوئی کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ پہلی اور آخری فلم تھی جسمیں انہوں نے اداکاری کی تھی۔ اسکے بعد وہ مستقل فلموں کے لئے گیت لکھنے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں فلم "دو بھائی" کے لئے گیت لکھے اور مقبولیت حاصل کی۔ ان کی آخری فلم "میرا سایہ" تھی۔ راجہ مہدی علی خاں کا یہ عروج کا زمانہ تھا۔ انہوں نے ۱۹۴۶ء تا ۱۹۶۶ء پورے بیس سال فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ قیام بمبئی کے دوران انکی شادی فرخ آباد ضلع فتح گڈھ کے نواب محمود علی خاں کی سب سے چھوٹی صاحبزادی طاہرہ سلطانہ سے ہوئی۔ اس وقت وہ بہت ہی کم عمر تھیں آٹھویں کلاس پاس کیا تھا۔ طاہرہ سلطانہ نے شادی کے بعد مخفیؔ تخلص اختیار کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

"ادب کے میدان میں وہ طاہرہ سلطانہ مخفی کے نام سے
مشہور ہیں اور شاید ہندوستان اور پاکستان میں وہ واحد

> ہستی ہیں۔ جو راجہ مہدی علی خاں کی طنزیہ یلغار کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔"

حسن اتفاق طاہرہ سلطانہ مخفی کا گھرانہ بھی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ طاہرہ سلطانہ کے دادا محمد علی خاں رئیس فتح گڈھ تھے اور نانا محمد اسمٰعیل جج تھے۔ ننہیال لکھنو کا مشہور خاندان تھا۔ ان کے ایک خالو سر قاضی عزیز الدین احمد وزیر تھے۔ دوسرے خالو نواب معشوق یار جنگ بہادر صاحب تصنیف و تالیف (انہوں نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ پر سوانح تاریخ حبیبی کا ترجمہ کیا۔) حیدر آباد (دکن) میں کمشنر تھے۔ ایک اور خالو مظہر الحق اپنے زمانے کے مشہور بیرسٹر تھے۔ جن کے ڈرائینگ روم کی تعریف مہاتما گاندھی نے کی تھی۔ اور ان کے نام کے ڈاک ٹکٹ بھی جاری ہوئے تھے۔ طاہرہ سلطانہ مخفی کی دو بڑی بہنیں ہیں۔ بڑی بہن شاہدہ محمود جن کے شوہر سید حبیب الدین صدیقی انعامدار آف کلس (پونہ) تھے۔ جو انگریزی اخبار "ہیرالڈ" سے وابستہ تھے۔ ان کے دو لڑکے ہیں وقار فاروقی عرف خالد جنہیں راجہ صاحب بے حد چاہتے تھے۔ انہوں نے آخری دنوں میں راجہ صاحب کی بڑی خدمت کی۔ دوسرے لڑکے جمیل فاروقی۔ طاہرہ سلطانہ کی دوسری بہن صابرہ محمود حیدر آباد (دکن) بیاہی گئیں۔ ان کے صاحبزادے عین الحبیب عرف التمش جنہیں پیار سے عینی بھی کہہ کر پکارتے ہیں اپنے خالو راجہ مہدی علی خاں کی طرح فلمی دنیا میں مصروف ہیں۔ طبیعت اور مزاج میں راجہ صاحب کی جھلک نظر آتی ہے۔ بڑی بہن شاہدہ محمود طاہر سلطانہ مخفی کے ساتھ بمبئی میں مقیم ہیں۔ طاہرہ سلطانہ مخفی کا بچپن رام نگر ضلع نینی تال میں گذرا۔ شادی کے بعد انہوں نے

میٹرک کی تکمیل کی۔ راجہ مہدی علی خاں اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ مخفی سے بیحد محبت کرتے تھے۔ ان سے انہیں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جس کا انہیں قلق تھا۔ تاہم انہوں نے اسکا غم نہیں پالا۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا۔

> "..... پھر یکا یک کرسیوں، میزوں، بستروں، دروازوں اور کھڑکیوں میں سے رنگ رنگ کی بلیاں برآمد ہونے لگیں۔ یہ سب بلیاں راجہ صاحب اور طاہرہ سلطانہ نے پال رکھیں ہیں اور ان کے گھر میں بچوں کی کمی کو پورا کرنے کی ایک دلفریب کوشش ہے۔"

ایک زندہ دل اور خوش دل انسان کو قدرت نے اولاد کی خوشی سے محروم رکھا تھا لیکن اس خوشی کی تکمیل کے لئے راجہ صاحب نے اپنے دوست احباب اور ملنے جلنے والوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اور بالخصوص اپاہج و معذور بچوں کو اپنی اولاد کیطرح پیار کرتے تھے۔

بقول کرشن چندر

> "یوں تو راجہ بہت نیک دل انسان تھا۔ انتہائی خاموشی سے اپنے غریب دوستوں، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا تھا۔ دستور کے خلاف اُس نے آج تک اپنے کسی دوست کی کاٹ نہیں کی۔ غیبت اور تکڑم سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اپنے اچھے

"دنوں میں وہ کبھی مغرور نہیں ہوا اور بُرے دنوں میں کبھی
تنگدل نہ بنا۔ غرض کہ اسطرح کی اور بھی بہت سی برائیاں
مرحوم میں تھیں جو موجودہ زمانے میں کسی بھی انسان کو
کامیاب بننے سے روک سکتی ہیں۔ مرحوم کو اپنی زندگی میں
جو کچھ ملا۔ اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے اپنی زندگی ہی
میں لٹا دیا۔" ۱

ان دنوں راجہ صاحب کی دوسری شادی کی افواہ پھیلنے لگی۔ حالانکہ نہ تو انہوں نے کوئی دوسری شادی کی اور نہ کسی سے معاشقہ کیا۔ وہ ہر کسی سے نہایت خوش دلی سے ملتے تھے خواہ عورت ہو یا مرد۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں خوش تھے۔ اولاد سے محرومی کے باوجود وہ اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ سے کوئی شکایت کی اور نہ مقدر سے شکوہ کیا۔ وہ اپنی ماں بھائی بہنوں اور رشتہ داروں سے جو پاکستان میں تھے تقسیم کے بعد گویا ایک طرح سے کٹ سے گئے تھے۔ صرف خط وکتابت جاری تھی پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا تھا۔ رام لعل کے استفسار پر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"لاہور میں میری والدہ، بہنوں اور بھائی کے علاوہ بیسوں
قریبی عزیز ہیں۔ کسی کا خط نہیں آیا۔ میری والدہ بہنیں اور
بھائی تو مجھ سے متنفر نہیں ہیں، توبہ کرو۔ کان پکڑو ایسی
باتیں جلدی میں مت سوچا کرو۔" ۲

نام کی مناسبت سے راجہ مہدی علی خاں کے مسلک سے متعلق لوگ غلط فہمی کے شکار ہوتے ہیں جب میں نے بیگم راجہ مہدی علی خاں سے استفسار کیا تو کہنے لگیں۔

"راجہ" کا لفظ اس لئے اپنے نام کے ساتھ جوڑ
لیا تھا کہ کسی خاندانی بزرگ نے بتایا تھا کہ ان کے آباواجد
اد کا سلسلہ نسب کسی راجپوت راجہ سے جا ملتا ہے۔ جبکہ ان
کے والد عنایت اللہ خاں یا ان کے چھوٹے بھائی عثمان علی
خاں نے کبھی اپنے نام کے ساتھ راجہ کا استعمال نہیں کیا۔
والد نے ان کا نام مہدی علی خاں رکھا تھا یعنی "مہدی"
بمعنی ہدایت کرنے والا کی رعایت سے۔ راجہ صاحب کا
مسلک "حنفیہ سنی" ہے۔ وہ اکثر جمعہ کو ماہم کی درگاہ
حضرت خطب کوکن شیخ علی بابا مخدوم فقیہہ مہاوتمی رحمتہ اللہ
علیہ پر حاضری دیا کرتے تھے۔" ۳

راجہ مہدی علی خاں بھاری بھرکم جسم کے مالک تھے۔ گول رعب دار چہرہ۔ گھنے کالے بال، کشادہ پیشانی اور گہری آنکھیں ابرو سیاہ چمکدار کشادہ سینہ تھا۔ آخر دنوں میں انہیں ذیابطیس کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ بظاہر وہ صحتمند دکھائی دیتے تھے۔ جسم میں پانی بھر جایا کرتا تھا۔ بہترے علاج کروایا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ حکیموں کے نسخے اور تجویز کردہ ادویات استعمال کرتے۔ کسی نے پانی میں چونا ملا کر پینے کا مشورہ دیا کہ ذیابطیس کے لئے مفید ہے۔

چنانچہ وہ چونا ملا ہوا پانی پینے لگے۔ جس کے نتیجے میں ان کے گردے خراب ہو گئے۔ انہیں ماہم ہسپتال میں شریک کر دیا گیا۔ ان دنوں گردوں کا عصری علاج نہ تھا۔ اذیت ناک تکلیف سہتا ہوا ہنستا ہنساتا یہ عظیم انسان آخر کار ۲۷ر جولائی ۱۹۶۶ء کی صبح اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت راجہ صاحب کی عمر کوئی پچاس برس تھی۔ جب ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی تو لوگوں کا اژدھام ان کے گھر پالی ناکہ پر جمع ہو گیا۔ سرشار سیلانی اس وقت کے مشہور شاعر اور ڈائیلاگ رائیٹر تھے۔ راجہ صاحب کے سانحہ پر جو دردناک منظر دیکھ کر فی البدیہہ کہا۔

تھکا ماندہ مسافر سو رہا ہے　　زمانہ کیا سمجھ کر رو رہا ہے

بقول پریم جی پروڈیوسر (میر اسایا) کہ

"ایک بہت بڑی شخصیت ہمارے درمیان سے چلی گئی۔
اگر وہ حیات ہوتے تو شاید اور بھی ادبی کارنامے وجود میں
آتے۔" ۱

راجہ مہدی علی خاں کے انتقال کی خبر نے ادبی دنیا میں غم واندوہ کی ایک ایسی فضاء پیدا کر دی کہ دنیائے ادب کے ہر شاعر وادیب نے اپنے رنج وملال کا اظہار کیا۔ یہاں چند ادیب وشعرا کے قطعہ تاریخیں اور تاثرات درج کئے جاتے ہیں جس سے راجہ صاحب کی عظمت اور وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"بیسویں صدی" نے یہ اندوہناک خبر صفحہ اول پر اسطرح شائع کی۔ "ہندوپاک میں ایکساں طور پر مقبول وہردلعزیز

نامور ادیب وشاعر اور طنز نگار اُردو کے عظیم المرتبت اور تاریخ ساز صحافی اور شاعر مولانا ظفر علی خاں کے حقیقی بھانجے اور پاکستان کی نامور شاعرہ محترمہ ح۔ب۔ صاحبہ کے فرزند ولبند راجہ مہدی علی خاں ۲۷ر جولائی ۱۹۶۶ء کی صبح ۳ بجے ماہم ہسپتال بمبئی میں انتقال کر گئے۔ اور اس اندوہناک حادثے سے ہندوپاک دونوں ممالک کے ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ مرحوم کی ۸۰ سالہ بوڑھی والدہ اپنے لال سے ہزاروں میل دور لاہور میں خون کے آنسو رو رہی ہے۔ بدنصیب ماں اپنے بیٹے کی آخری بار صورت بھی نہ دیکھ سکی۔"

(بیسویں صدی اکتوبر ۱۹۶۶ء)

اختر واصفی گوجرانوالہ مغربی پاکستان نے قطعہ تاریخ یوں لکھی۔

تواریخ وفات طوطئ ہند مہدی علی

۱۹۶۶ء

از گلشن سخن اختر واصفی

۱۹۶۶ء

دل پہ اختر کے ہوا کیا مرگ مہدی سے اثر　　کیا بتاؤں تجھکو میں اے خوشتر اندوہ گیں

ہائے وہ رنگیں نوا شاعر ادیب زندہ دل — جسکا ثانی ڈھونڈنے سے بھی نہ پائینگے کہیں
کونسے حاسد کی اسکو کھا گئی والے نظر — بزم یاراں کی ابھی کل تک وہ رونق تھا یہیں
آج "آواز حزیں" سے کہہ دیا ہاتف نے یہ — "ہوگیا مہدی علی خاں عازم خلد بریں"

۱۸۷۶ + ۹۰ = ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون "اردو ادب کا فناڈو" میں راجہ مہدی علی خاں کو "فناڈو" قرار دیا جو سرکس میں ایک جوکر تھا وہ اپنے سینے میں ہزاروں غم لئے لوگوں کو ہنساتا جو اس کا پیشہ تھا۔ راجہ صاحب بھی اپنے اندر درد و کرب لئے زندگی بھر لوگوں کو ہنساتے رہے۔ لکھتے ہیں۔

"اس دنیا میں جو بھی وارد ہوتا ہے اپنا مشن اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ بعض لوگ انسان کو جہالت اور تاریکی سے اور بعض اسے دکھوں اور آرزوؤں کے چنگل سے رہائی دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بعض ایسے بھی ہیں جو انسان کو اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کی تحریک دیتے ہیں۔ اور یہ ایک بڑا مشن ہے۔ لیکن ایک بالکل محدود تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو کوئی حکیمانہ یا پیغمبرانہ مقصد لے کر وارد نہیں ہوتے۔ اُن کا کام فقط اتنا ہوتا ہے کہ وہ آگے بڑھکر بڑی آہستگی سے انسان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے

آنسوؤں کو پونچھ ڈالتے اور اسے ذرا سا گدگدا کر زندگی کے گریناک اندھیروں پر مسکرانے کی سکت عطا کر دیتے ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں اسی گروہ کا ایک نامور فرد تھا.....
اس مختصر سے مضمون میں راجہ مہدی علی خاں کے فن کی خصوصیات کو پیش کرنا مقصود نہیں۔ مقصود صرف اس کے فن کا اعتراف ہے۔ وہ بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں طنز و مزاح کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اور روتے ہوؤں کو ہنسانا اسکا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مگر آج کہ وہ یکایک ہمیں اپنے آخری مذاق کا ہدف بنا کر کسی چور دروازے کے راستے بھری بزم سے غائب ہوگیا۔"[1]

نریش کمار شاد نے منظوم خراج پیش کیا۔ جو بیسویں صدی کے صفحہ اول پر راجہ صاحب کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

خوشتر نے سچ کہا ہے کہ راجہ کی موت سے — دل پاش پاش ہے تو کلیجہ ہے داغ داغ
مرجھا گیا ہے باغ ظرافت کا ایک پھول — گُل ہوگیا ہے طنز کی محفل کا اک چراغ
اُس کی مفارقت کو کہاں تک رو دیئے — پیدا کہاں اب ایسا خوش اطوار و خوش دماغ

جمیل ملک کے منظوم تاثرات "اوراق" پاکستان نے شائع کیا۔

ہم فریاد کریں یا گھائل دل کو شاد کریں — ہنستے لب اور روتی آنکھیں تجھ کو یاد کریں

دوزخ کو جنت میں ملایا، تونے تو سکھ پایا — ہم اپنا یہ قریہ جاں کیوں کر آباد کریں
اندر مرنے کی تیاری باہر دنیا داری — جان اور تن کو اس دورنگی سے آزاد کریں
اپنی ذات پہ ہنس لینے سے رنگ اگر کٹ جائیں — ہنس ہنس تیری یاد منائیں کیوں فریاد کریں

ظفر نسیمی ایم۔اے۔ نے قطع تاریخ لکھی۔

اُسے ہر طرف ڈھونڈتی ہے نگاہ — نہیں کوئی صبر و تحمل کی راہ
بڑی درد انگیز و غمناک ہے — ''قضا راجہ مہدی علی خاں کی آہ''

۱۹۶۶ء

رام لعل نے راجہ مہدی علی خاں کے سانحہ ارتحال پر ایک طویل مضمون اپنی کتاب ''دریچوں میں رکھے چراغ'' میں لکھا ہے۔ تاہم تعزیتی پیام کا حصہ یوں ہے۔ جو بیسویں صدی نومبر ۶۶ء میں شائع ہوا۔

''روتوں کو بے دریغ ہنسانے والا وہ خوش باش، خوش طبع، خوش خلق اور خوش خور انسان آج زمین کی کتنی تہوں کے نیچے پڑا ہوا ہماری بے بسی پر قہقہے لگا رہا ہوگا اور مصنوعی غصے سے کہہ رہا ہوگا۔'' جاؤ میں تم میں سے کسی سے نہیں بولتا۔ آج ہماری بول چال کا فل اسٹاپ''!!

کرشن چندر نے لکھا۔

''اُس کی اُونچی بے باک و معصوم ہنسی یاد آتی ہے۔ اُس کی

قنطاسی کی حد تک پہنچی ہوئی ظرافت نگاری اور کھلنڈرا پن۔ وہ ایک بچہ تھا ابھی اور جب موت کسی بچے کو ہمارے بیچ میں سے اُٹھا کر لے جاتی ہے تو اس کائنات کی معصومیت میں ضرور کہیں پر کوئی کمی ہو جاتی ہے۔''

(بیسویں صدی نومبر ۶۶ء ص ۹۳)

رئیس مینائی نے منظوم خراج پیش کیا ہے۔

آشفتگان زیست کا چہرہ اُتر گیا — اے موت تیرا مقدر سنور گیا
جو رہسپار مسلک اخلاص و عشق تھا — بزم سخن سے آج وہ اہل ہنر گیا
وہ کیا ڈریگا قبر کی تاریکیوں میں بھی — راہ وفا میں جس کا اُجالا بکھر گیا
اب محفل حیات ہے سونی پڑی ہوئی — بزم جہاں سے کون یہ صاحب نظر گیا
اک عمر جسکے ہجر میں روئینگے یار سب — احباب کو الم میں وہ کیوں چھوڑ کر گیا
پہلے مجید و سالک و شوکت چلے گئے — وہ بھی قضا کے دوش پہ احسان دھر گیا

مدحت الاختر نے یوں لکھا۔

اُس کا جادو کا قلم / جان ہر تصویر تھا / نوک نشتر حرف حرف / جو سخن تھا تیر تھا / دشت و صحرا بام و در / غنچہ و گل خار و خس / زندگی کے ساتھ تھا / زندگی کا ہر نفس / لیکے پھولوں کی ہنسی / دشت میں آیا تھا وہ / زندگی کی راہ میں / پیڑ کا سایہ تھا وہ / وہ ہنسی چپ ہوگئی / اور وہ سایہ کھو گیا / موت کی آغوش میں / وہ مسافر سو گیا / جسکا جادو کا قلم / جان ہر تصویر تھا / وہ مصور کھو گیا......!

میرزا ادیب کا تعزیتی مضمون ''اوراق'' پاکستان میں شائع ہوا جسکے چند سطور راجہ صاحب کے فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

''اُردو کی خوبصورت ترین مزاحیہ نظموں کا خالق چل بسا ہے۔ وہ نغمہ طرب ڈوب گیا ہے جو ہونٹوں کو مسکراہٹیں اور دلوں کو خوشیاں دیتا تھا۔ وہ قہقہہ ختم ہو چکا ہے جو پاک و ہند کے فضاؤں میں گونج رہا تھا۔ اور دھوپ کی طرح ہر گھر میں پہنچ جاتا تھا۔ میں نے راجہ کو کہا تھا... ''سنا ہے بمبئی میں مردہ زندہ ہو گیا ہے۔!'' اب میں کس سے مخاطب ہو کر کہوں.... بمبئی میں اُردو کی سچی مزاحیہ شاعری مرگئی ہے۔''

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن ڈی۔لٹ نے طویل تعزیتی مضمون لکھا جو بیسویں صدی اکتوبر ۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

یہ آدمی بچے کی نفسیات کے مطالعہ کے لئے اہم مواد تھا.... ایک بچے کی معصومیت، ایک بچے کی ضد، ایک بچے کا بھولا پن، ایک بچے کی خوشی، ایک بچے کا غصہ، ایک بچے کی مسکراہٹ، ایک بچے کا خواب...... میں نے راجہ مہدی علی خاں میں کیا نہیں دیکھا ہے...... میں اس بچے کو بھول نہیں سکتا.... ع جب نام تیرا لیجئے تب چشم بھر آوے۔!

خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی سے راجہ مہدی علی خاں کی اسقدر گہری دوستی تھی کہ جس کی مثال قائم ہو گئی تھی لکھتے ہیں۔

''تقسیم وطن سے پہلے سے راجہ مہدی علی خاں فلمی دنیا سے وابستہ تھے لیکن اس کے باوجود وہ ''فلمی شاعر'' نہیں بلکہ ایک صاحب طرز طناز تھے۔ فلمی شاعری کرنا محض ان کا ذریعہ معاش تھا۔ فلمی دنیا میں بلبل ہزار داستان کیطرح وہ برسوں چہکتے رہے۔ مگر ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا.... فلمی دنیا میں برسوں چہکنے کے بعد یہ بلبل ہزار داستاں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ دوسروں کو ہنسانے والا ہمیں رُلا کے جا چکا ہے۔ لیکن اس کے قہقہے ہمیشہ ایوان ظرافت میں گونجتے رہینگے۔''

راجہ مہدی علی خاں کو ان کی وصیت کے مطابق ماہم قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ بنائی گئی۔ جلوس جنازہ میں ہزاروں سوگوار شریک تھے۔ حسن اتفاق جب جنازہ لے جایا جارہا تھا سڑک کی دونوں جانب عمارتوں سے ریڈیو سیلون سے راجہ مہدی علی خاں ہی کے گیت گونج رہے تھے۔ ''لگ جا گلے کے پھر یہ ملاقات ہو نہ ہو'' ہر ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں لاکھوں تعزیتی خطوط بیگم طاہرہ مہدی علی کو لکھے گئے۔ ہند و پاک کے اخباروں ادبی رسالوں اور جرائد میں سینکڑوں تعزیتی مضامین نثر و نظم شائع ہوئے۔ جن کا احاطہ مشکل ہے۔

عادات واطوار کے اعتبار سے راجہ مہدی علی خاں جسقدر نرم دل واقع ہوئے تھے مزاج اتنا ہی گرم تھا۔طبیعت کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتے تھے۔لذیذ کھانوں اور مرغ و ماہی کے شوقین تھے۔سالن میں نمک یا مرچ ذائقہ سے زائد ہوجائے تو برتنوں کی خیر نہ ہوتی۔کانشی ناتھ (باورچی) اور طاہرہ سلطانہ کی خبر لی جاتی۔گھر میں آئے دن دعوتیں ہوا کرتی ھیں۔وہ کھانے اور کھلانے کے بڑے شوقین تھے۔بقول پرآن (مشہور فلمی اداکار ویلن) کہ ''لوگ اکثر کھاتے ہیں جینے کیلئے لیکن راجہ صاحب جیتے ہیں کھانے کیلئے۔'' حیدرآبادی ''پائے'' طاہرہ سلطانہ خود بڑے اہتمام سے بنایا کرتیں۔سبزی ترکاری کو گھاس پھوس کہا کرتے تھے وہ گوشت خور تھے۔مرغن غذاؤں کی وجہ جسم بھاری ہوگیا تھا وہ پہلے ہی دوہرے جسم کے مالک تھے۔چائے دودھ کیساتھ دن میں دوتین مرتبہ پیتے اور شکر حسب ذائقہ ڈال لیا کرتے تھے۔جب انہیں ذیابطیس ہوگیا تو شکر سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ مٹھائی کے بڑے دلدادہ تھے پرہیز کے باوجود آنکھ بچا کر چٹ کرجاتے۔طاہرہ سلطانہ ان کا بڑا خیال کرتی تھیں۔سبھی پھل موسم کے بڑے شوق سے کھاتے لیکن انہیں غالب کی طرح آم بڑے مرغوب تھے۔شراب سے سخت نفرت تھی۔گھر کی نجی محفلوں میں کوئی شراب پیتا تو بڑی کراہیت محسوس کرتے۔ایک دفعہ فلمی اداکارہ سادھنا کی شادی میں کسی نے شراب پلادی۔ جب نشہ اترا تو اس پر برہم ہوگئے۔سگریٹ کے عادی نہ تھے لیکن کبھی کبھار یاردوستوں کی خاطر پی لیا کرتے۔کچھ دن حقہ پینے کا شوق ہوا تھا پھر اُسے بھی ترک کردیا۔البتہ پان کے رسیا تھے۔پان میں زردہ بہت زیادہ کھاتے۔راجہ صاحب کے پان کھانے کا منفرد انداز تھا۔

پان منہ میں رکھا تھوڑا سا چبایا اور لطف لے کر اُگالدان میں تھوک دیتے۔اُگالدان پان کی پیک سے بھر جاتا۔دن میں دس بارہ مرتبہ صاف کرنے کی نوبت آتی۔گویا ایک خادمہ صرف اُگالدان کی صفائی کے لئے مختص تھی۔لباس ہلکا پھلکا پہنتے تھے۔یعنی گھر میں یوں تو بنیان اور تہہ بند ہوا کرتی اور کبھی کرتہ پہن لیتے اور باہر جائیں تو پینٹ بوشرٹ ٹائی کوٹ اور شوز پہنتے۔ گھر میں عام طور پر چپل ہی استعمال کیا کرتے تھے۔زندگی میں انہوں نے شیروانی یا ٹائی اور لباس زیب تن نہیں کیا۔ہلکے اور مہذب رنگ پسند تھے۔کھیل کود وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھی جاگنگ کو نکل جاتے۔گرمی انہیں برداشت نہ ہوتی تھی۔دن میں دوتین بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے۔صبح جب وہ غسل سے فارغ ہوتے تو ان کا ملازم ان کے پاؤں پونچھتا اور بیگم مہدی انہیں کپڑے پہناتیں بالوں میں تیل ملتی اور کنگھی کرتیں۔اس کے بعد راجہ صاحب صبح کی نماز سے فارغ ہوکر اپنی مخصوص کرسی ''راکنگ چیر'' پر براجمان ہوجاتے۔اس دوران ملاقاتی آتے تو ان سے ملاقات کرتے۔اس تعلق سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

> ''عام طور سے اپنی جھولا نما کرسی چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ خود مہمان ان کی راکنگ چیر کے رکنے یا تیز تیز چلنے ہی سے راجہ صاحب کے موڈ کے بارے میں اندازہ کرلیتے ہیں۔مثلاً اگر مہمان کی آمد پر کرسی میں زلزلہ آجائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مہمان سامنے بچھے ہوئے صوفے کے

> آخری کونے میں بخوشی بیٹھ سکتا ہے۔ اور اگر کرسی دفعتاً رک جائے اور راجہ صاحب کی زبان کاشی ناتھ کو اس کے سلسلہ نسب کے بعض نازک مقامات سے آگاہ کرنے لگے تو مہمان فوراً جان لیتا ہے کہ صورت حال خطرناک ہے۔'' ۱

ملاقاتیوں میں اگر کوئی حاجت مند ہوتو راجہ صاحب حتیٰ المقدور امداد کرتے۔ کوئی سفارش کے لئے آتا تو سفارشی خطوط لکھ دیتے۔ بیروزگار ہوتو کام دلوادیتے۔ جب تک کسی کو کام نہ ملے وہ راجہ کی جیب سے وظیفہ پاتا۔ غریبوں، بیواؤں، یتیموں کی امداد میں روحانی تسکین محسوس کرتے۔

بقول خوشتر گرامی

> ''بیگم سے کہتے یہ غریب آدمی جو آیا ہے اسے پچاس روپے دے دو۔ اس بیچارے کو اپنی بیٹی کا کنیادان کرنا ہے اسے فوراً دوسو روپے دے دو۔ اسے فلم میں کوئی کام نہیں ملا۔ فی الحال اسے سو روپے دے دو.....طاہرہ! یہ عورت بہت تنگدست ہے اسے کچھ دے دو۔ پھر ڈاک کی چھان بین ہوتی۔ ڈاک سے آئے ہوئے تمام خطوط خود بہ نفس نفیس کھول کر پڑھتے اور خود ہی جواب لکھتے۔'' ۲

راجہ مہدی علی خاں ایک مخلص اور درد مند دل کے مالک تھے۔ خطوط کے جواب لکھنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ خطوط ہی کے ذریعہ کئی دوست بن گئے تھے۔ ادبی دنیا اور فلمی دنیا میں ان کے لاکھوں پرستار تھے۔ مخلص دوستوں پر جاں نثار کرتے۔ ریاکار دوستوں کو تاڑ لیتے اور وہ ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان سے ملنا تک گوارا نہ کرتے۔ خوش اخلاق ملنسار اور قہقہہ باز آدمی تھے۔ ان کی باتیں لطیفوں کی طرح ہوا کرتیں۔ بات میں بات پیدا کر کے محفل کو لالہ زار بنادیتے جو کوئی ایک بار ان سے ملے بار بار ملنا چاہتا اور ان کی ایک ملاقات یادگار ملاقات بن جاتی۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ دوستی میں بیہودہ مذاق اور بے حیائی پر برہم ہوجاتے۔ ادبی مذاق پر خود بھی قہقہہ لگادیتے۔ بظاہر تو وہ جاہ و جلال کے آدمی تھے لیکن ان کا دل نہایت نرم اور محبت سے لبریز تھا۔ بڑی بے تکلفی سے ملتے جیسے بہت پرانی ملاقات ہو۔ ان کی تحریروں میں بالخصوص خطوط میں وہی بے تکلفی اور بے باکی ہے۔ رعب دار چہرہ اور بھاری بھرکم آواز سے لوگ گھبرا جاتے تھے۔ جو بھی گھر آتا بڑی تواضع ہوتی۔ ضیافتوں کے رسیا تھے۔ کبھی کوئی ان کے گھر سے بھوکا نہیں لوٹا۔ جوتشوں کی بڑی قدر کیا کرتے۔ آخری دنوں علم نجوم پر بڑا عقیدہ ہوگیا تھا۔ بخاری صاحب کی جو Astrologist تھے بڑی عزت کرتے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ راجہ صاحب کا ستارہ عقرب ہے۔ اور آٹھ نمبر ان کے لئے نہایت فائدہ مند ہے۔ وہ ہزاروں روپئے نجومیوں پر خرچ کر ڈالتے تھے اور اکثر دھوکے بھی کھا جاتے۔ علم نجوم کی ڈھیروں کتابیں انہوں نے جمع کر رکھی تھیں۔ اور ان کا مطالعہ بڑے انہماک سے کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اپنے مضمون میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے جس سے راجہ صاحب کے اس عقیدہ اوران کی چلبلی طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''میں صرف دو برس اور زندہ رہونگا!'' راجہ مہدی علی خاں نے پانی کا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا...... کس اُلو کے پٹھے نے کہد یا آپ سے! میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''ایک نجومی نے......... انہوں نے اپنے خاص انداز سے کہا۔ بہت بڑا نجومی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے میرے بارے میں سب کچھ کہد دیا....... آپ ملینگے تو چہرہ دیکھتے ہی کہد یگا کہ شکیل الرحمٰن کی کتنی محبوبائیں ہیں اور اس مکار نے کتنی لڑکیوں سے عشق کیا ہے.......... میں پان چباتے ہوئے ان کے قریب چوکی پر بیٹھ گیا اور سامنے پڑی ہوئی ایک کتاب اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ پامسٹری کی کتاب تھی۔

''راجہ صاحب! پامسٹری کی ان کتابوں کو الماری میں بند کر دیجئے نجومیوں سے ملنا چھوڑ دیجئے۔ خدا کی قسم عمر بڑھ جائیگی۔ میں نے مشورہ دیا۔'' ۲؎

پامسٹری کی ڈھیر ساری کتابیں جمع کر رکھی تھیں آخر عمر میں راجہ صاحب کو کچھ ایسا

عقیدہ ہو گیا تھا کہ جو بھی ان سے ملنے آتا راجہ صاحب اُس کے ساتھ یہی گفتگو کرتے۔ ان دنوں کوئی نہ کوئی نجومی آجاتا۔ اور راجہ صاحب اندھی عقیدت میں دھوکا کھا جاتے۔ طاہرہ سلطانہ (بیگم راجہ مہدی علی خاں) نیک نفس اور فرمانبرداری میں سب کچھ سہہ جاتیں۔ ایک دفعہ ایک ''بابا'' گھر آگئے اور کچھ ایسے راجہ صاحب کو اپنا گرویدہ بنالیا کہ راجہ صاحب اس کی بڑی تواضع اور کئی دنوں اپنے ہاں مہمان رکھا۔ ان دنوں طاہرہ سلطانہ کو بڑی زحمتیں اُٹھانی پڑی۔ دن میں کئی بار چائے وغیرہ کا انتظام کرنا بابا کی فرمائیشی کھانے تیار کرنا۔ وغیرہ کافی دنوں بعد وہ رخصت ہوا تو راجہ صاحب نے اسے تحفے تحائف اور نقدی دے کر رخصت کیا۔ کچھ دنوں بعد ایک عورت بابا کو تلاش کرتی ہوئی راجہ صاحب کے گھر پہنچی اور کہا ''وہ'' کہاں ہے؟ راجہ صاحب کے دریافت کرنے پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ عورت بابا کی بیوی ہے جبکہ بابا نے انہیں ''مجرد'' بتایا تھا۔ جب دوسری مرتبہ وہ آیا تو راجہ صاحب نے اسے دھکے دے کر باہر کر دیا۔ اس طرح راجہ صاحب کئی دفعہ ان ڈھونگیوں سے دھوکہ کھاتے رہے تاہم ان کے اس عقیدے میں کوئی فرق نہ آیا۔

رام لعل اپنے ایک مضمون میں جو انہوں نے راجہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بارے میں لکھا تھا اس میں رقم طراز ہیں۔

''وہ کیر یوز کی نیومرولوجی میں بھی اعتقاد رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے اور میرے ناموں کے اعداد وشمار نکال کر میرے ساتھ ہاتھ ملا کر کہا۔ ''میری اور تمہاری دوستی پکی

ہے۔ کبھی نہیں ٹوٹے گی۔'' میں نے انہیں ان کی غلطی کا احساس دلایا کہ انہوں نے میرا نمبر غلط نکالا ہے تو کتاب کے مطالعہ میں پھر کھو گئے اور پھر بڑی مایوسی کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی بات غلط ثابت کر دی تھی۔ لیکن انہوں نے اور کتنے دوستوں اور عزیزوں سے جن کے ساتھ اپنے رشتے کو مستحکم تر سمجھتے تھے۔ ۲۷ر جولائی کو اچانک انتقال فرما کر اپنی اور دوسروں کی خوش فہمی دور کر دی ان کی باتوں میں یقین نہ رکھ کر میں نے خود کو کتنے بڑے صدمے سے بچالیا ہے۔ ایک مخلص دوست کی موت کا صدمہ برداشت کر کے میں نے ایک وہم سے بھی نجات پالی ہے یہ دونوں موتیں کتنی متضاد قسم کی ہیں۔'' جگدیش بمل نے کہا۔

''راجہ مہدی علی خاں نہایت شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ جب کبھی ہم اپنی طبیعت میں بوجھل پن محسوس کرتے ان کے ہاں چلے جاتے۔ ان کی شگفتہ باتوں سے طبیعت ہلکی ہو جاتی۔ ساری اُلجھنیں پریشانیاں دور ہو جاتیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہتے۔ ''آج کیسے آنا ہوا....'' میں کہتا۔ بندے کو پیسے سے زیادہ اور کیا ضرورت ہوگی....!'' ''پرسوں ہی تو

دس کروڑ دیے تھے۔ اتنا جلدی ختم ہو گئے؟'' اس بار پندرہ کروڑ رکھ لو...... پھر آئندہ پھوٹی کوڑی نہ ملے گی...!'' اور ہم ان کی ان پر لطف باتوں سے محفوظ ہوتے۔ وہ کبھی خود کے بھاری بھرکم جسم اور ڈیل ڈول پر بھی لطیفے جڑ دیا کرتے۔ ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ وہ میری بیگم (عالیہ) سے ''حیدرآبادی بیگن'' کھلانے کی فرمائش کرتے۔ جب کبھی گھاس پوس کھانے کی خواہش ہوتی وہ ہمارے گھر چلے آتے۔ دل کے وہ راجہ تھے بے سہاروں کے سہارا، غمزدہ اور پریشان حال لوگوں کیلئے مسیحا تھے۔''

راجہ مہدی علی خاں طبعاً عاشق مزاج تھے۔ لیکن چھچھورا پن قطعی برداشت نہیں کرتے تھے۔ کسی پر غصہ آ جاتا تو سخت برہم ہو جاتے لیکن فوری معمول پر آ جاتے تھے ان کا غصہ وقتی ہوا کرتا تھا۔ اور پھر وہی ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہوتیں۔ انہیں غم تھا تو فقط اپنی بگڑتی صحت کا۔ اولاد سے محرومی کا اور اپنی ماں کا........ لیکن اس کا احساس کبھی اپنے چہرے سے تک ظاہر نہیں کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

''حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شخص جسکی زندگی ایک مسلسل کرب کی تصویر تھی جب شعر کہنے لگتا تھا تو اس کے قلم سے خون کی بجائے امرت چھلکتا تھا۔ آنسوؤں کی بجائے تبسم

ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا تھا۔ اور ایک عالم اس کی میٹھی کومل باتوں میں اپنے دکھوں کا مداوا تلاش کرتا تھا۔ مسعود شاہد مرحوم نے کسی زمانے میں سرکس کے ایک مسخرے فناڈو کے بارے میں ایک افسانہ لکھا تھا کہ کس طرح فناڈو کا دل رو رہا ہوتا تھا اور زبان محفل کو زعفران زار میں تبدیل کرتی جاتی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ راجہ مہدی علی خاں بھی تو اُردو ادب کا فناڈو تھا کہ ہر چند اس کی اپنی ذات دکھوں، محرومیوں اور نارسا آرزوؤں کی آماجگاہ تھی۔ لیکن اس کی زبان اور قلم خوشیوں اور قہقہوں کی تقسیم پر مامور تھے۔" ۲

کبھی گھر کی نوک جھونک گیت یا نظم میں ڈھل جاتی تو روزمرہ زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات مواد فراہم کر دیا کرتے۔ ایک دفعہ بیگم ان کے غصہ کی وجہ روٹھ گئیں پھر تھوڑی دیر بعد انہیں مسکراتے دیکھا اور بس راجہ کی زبان پر بے ساختہ مصرعہ آ گیا۔ "آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے" پھر کیا تھا یہ فلمی گیت بن گیا۔ اکثر وہ بسوں، ٹرین یا کبھی کبھی چلتے پھرتے، بیٹھے بیٹھے ہی شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک پرسنل سکریٹری بھی رکھا تھا۔ جس کا تخلص انہوں نے وفا رکھا تھا۔ اس لئے کہ اس پر انہیں کوئی اعتبار نہ تھا۔ خطوط کے جوابات ہو یا گیت کی نقل یا پھر نظموں کو پریس بھیجنا ہوتا تو خود ہی اپنی نگرانی میں انجام دیتے۔ سکریٹری برائے نام تھا بے کار لوگوں کو کوئی نہ کوئی کام سے لگا دیتے تھے۔ راجہ مہدی علی خاں

کے دوستوں کی بڑی لمبی فہرست ہے۔ جن میں قابل ذکر سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، شاہد احمد دہلوی، خوشتر گرامی، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، ڈاکٹر وزیر آغا، انور سدید، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، اختر مراز، محمد طفیل احمد، کلیم یوسف حُسین، کرنل سلیم، میجر سلیم، جگدیش بمل، اعظم راہی، اوپندر ناتھ اشک، انصاری، اختر الایمان، سلیمان اریب، جانثار اختر، مجروح سلطانپوری، رام لعل، ست پرکاش شوق وغیرہم۔ ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک میں راجہ صاحب کے چاہنے والوں کی کثیر تعداد تھی جن سے وہ خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ نئے نئے دوست بنانا اور ان سے والہانہ محبت کرنا۔ اپنوں اور اجنبیوں سے بے تکلف ہو جانا راجہ صاحب کی طبیعت کا خاص وصف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک بار ملنے والا شخص انہیں ہمیشہ یاد رکھتا تھا۔ اور آج بھی جبکہ ان کے گزرے ہوئے چالیس سال سے زائد عرصہ بیت گیا۔ پھر بھی ان کی یادوں کی شمع روشن ہے۔ فلمی دنیا میں بھی ان کے عقیدتمندوں کی کافی تعداد ہے بڑے احترام سے ان کا نام لیا جاتا ہے۔ پریم جی پروڈیوسر نے بتایا۔

"آج ہمارے درمیان وہ مہان آتما نہ رہی۔ ایسے لوگ بہت کم جنم لیتے ہیں۔" ۱

راجہ مہدی علی خاں زندہ دلی کیساتھ ساتھ روشن خیال اور آزاد منش آدمی تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مذہبی وسیع النظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کا دل تعصب وعناد سے پاک تھا۔ وہ ہندو مسلم، ذات پات کا کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھتے تھے بلکہ بلاتکلف کچھ ایسے جملے کہہ جاتے کہ لوگ ان جملوں میں ظرافت کی وجہ کوئی اثر لئے بغیر لطف اندوز ہوتے۔ مثلاً نریش کمار شاد کو

دیئے گئے انٹرویو کے چند جملے ملاحظہ ہو۔

"تو نئی دلی سے بمبئی میں میرا انٹرویو لینے چلا آیا۔ کیا تو
بہت بڑا بے شرم ہے؟ اگر ہے تو تو کیوں ہے میں کیوں
نہیں؟ بھلے آدمی یہ تو سوچ کہ میرا انٹرویو لینے سے قوم،
میرا مطلب ہے شاعروں کی قوم پر تیرا کیا امپریشن پڑیگا؟
مزاح نگاروں کی دل آزاری ہوگی۔ اے ناعاقبت اندیش
کمار! اگر تو مسلمان ہوگیا تو کبھی نہیں بخشا جائیگا۔" ۲

کبھی انہوں نے اپنے ہندو دوستوں کو ہندو اور مسلمان دوستوں کو مسلمان نہیں جانا بلکہ انسان کو انسان اور انسانیت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کی نظر بڑی پاک وصاف تھی جتنا کہ ان کا دل۔ وہ اپنے خطوط میں بھی بڑی بے باکی کیساتھ اس قسم کے جملے استعمال کرتے تھے۔ رام لعل کو لکھتے ہیں۔

"نوسو برس کے بڈھے کھوسٹ مسلمان ...... مسٹر اللہ رکھا
عرف رام لعل! سلام علیکم! شرم نہیں آتی کہ نوجوان ہندو پر
خواہ مخواہ رعب ڈالتے ہو۔ تم لوگوں کی ذات ہی کچھ ایسی
ہے۔ جھوٹے رعب داب کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ ایک تو
میرے دوسو خطوط کا جواب نہیں دیا......." ۱

رام لعل کے خط میں کس قدر بے تکلفی اور بے باکی ہے ایک اور خط ملاحظہ ہو۔

"میں نے خط میں Pure گھی کا دھبہ لگا کر بھیجا تھا جسے
تم مٹی کا تیل یا پٹرول کہہ رہے ہو۔ ہندوستان میں تم
لوگوں نے اقلیتوں کی یہی حالت بنا رکھی ہے۔ ان
بچاروں کا خالص گھی بھی تم لوگوں کو پٹرول معلوم ہوتا ہے۔
افسوس! مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال جی کی نصیحتیں
اور لکچر تم لوگ کتنی جلدی بھول گئے۔" ۲

راجہ مہدی علی خاں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی عظمت اس کی انسانیت سے ہے نا کہ اس کی رنگ ونسل سے مذہب یا دھرم کا تعلق اس کی روح سے ہوتا ہے جسم سے نہیں۔ وہ رواداری اور بھائی چارگی کے حامی تھے۔ جسم کا وجود روح کی موجودگی سے ہے اور جب روح نکل جائے تو جسم کی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس خیال کو راجہ صاحب نے رام لعل کے خط میں کچھ اس طرح لکھا ہے۔

"تسلیم کے بعد عرض ہے کہ میں مرگیا تھا۔ ایک ٹانگ
مسلمانوں نے قبر میں دفن کردی، ایک ٹانگ ہندوؤں نے
جلادی۔ سر سکھ لے گئے۔ ایک بازو مہاتما بدھ کے پجاری
لے گئے۔ باقی حصہ کتے کھا گئے...... یہ ہوا میرا انجام....
فقط...... مرحوم" ۱

اس طرح وہ اپنی ظرافت سے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں میں ہر دلعزیز تھے اور

خود بھی اپنے ناموں کے ساتھ ہندو نام جڑ لیا کرتے مثلاً راجہ مہدی علی خاں بھاٹیہ، پنڈت راجہ مہدی علی خاں، راجہ رام علی خاں، راجہ ہندو علی خاں وغیرہ۔ راجہ مہدی علی خاں ''سیاست'' سے دور رہا کرتے تھے۔ ان کا تعلق نہ تو کسی سیاسی گروہ سے تھا نہ کسی تحریک سے وہ وابستہ رہے۔ نریش کمار شاد نے ان سے ان کی سیاسی نظریات سے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ

> ''بڑا خطرناک آدمی ہے تو میرے یار! جو مجھ سے ایسا خوفناک سوال پوچھ رہا ہے کہ میرے سیاسی نظریات کیا ہیں؟ کیا تو مجھے قید کرا کے میری جائیداد پر خود قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر میں اگر یہ کہوں کہ کمونسٹ ہوں تو کانگریسی حضرات تھو تھو کریں گے۔ اور بمبئی کی پبلک مجھے پیٹ ڈالے گی۔ اور اگر کہوں کہ کانگریسی ہوں تو خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور راجگوپال اچاریہ میرا حقہ پانی بند کر دیں گے۔ رہا سوشلزم تو وہ مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ ایک موچی سے پوچھا تو اس نے بتانے سے انکار کر دیا۔'' ۲

حالانکہ یہ وہ دور تھا کہ آدمی کے سیاسی نظریات بدل رہے تھے۔ اور سیاسی حالات سے ادیب و شاعر بھی متاثر ہو رہے تھے۔ شاعری بھی متاثر تھی۔ لوگوں میں انقلابی جوش تھا۔

اور پھر ملک کی تقسیم کے بعد ہندو مسلم نظریات میں بہت بڑا فرق آ گیا تھا۔ ہندو مسلم کے متنفر جذبات بھڑکنے لگے ملک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ہر طرف عزت و ناموس کے لالے پڑ گئے تھے۔ حالانکہ فلم انڈسٹری شروع ہی سے ہندو مسلم کے بھید بھاؤ سے پاک تھی۔ ان کے ہاں ذات پات کی کوئی دیوار نہ تھی یہاں صرف فن اور فنکار ہی کی پہچان تھی۔ ان حالات میں فلم انڈسٹری مالی مشکلات کا شکار ہوگئی جسکی وجہ فلمی دنیا سے جڑا ہوا ہر شخص معاشی پریشانیوں کا شکار تھا۔ ۱۹۵۷ء میں راجہ صاحب بھی معاشی اعتبار سے پریشان ہوگئے تھے۔ وہ ان حالات سے بھی دل برداشتہ ہوگئے تھے یہاں تک کہ واپس پاکستان جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ جب مدن موہن جی (میوزک ڈائرکٹر) جو راجہ صاحب کے گہرے دوست تھے انہیں پتہ چلا کہ راجہ پاکستان لوٹنا چاہتے ہیں تو وہ فوراً ان کے گھر پہنچے اور انہیں روک لیا۔ پھر سے گیت لکھنے کا حوصلہ دیا۔ فلم ''دو بھائی'' کے گیت لکھوائے اور یہی گیت ان کی شہرت کا پہلا زینہ ثابت ہوئے۔ مدن موہن جی اور راجہ مہدی علی خاں کی دوستی ان کے آخر دم تک برقرار رہی۔

راجہ صاحب کا مزاج قلندرانہ تھا۔ گھریلو حالات بھی کچھ ایسے نہ تھے کہ راجہ صاحب کو روزگار کے لئے در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتے۔ والد کی زمینداری تھی لیکن راجہ صاحب سیر سپاٹے کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایف۔ اے (انٹرمیڈیٹ) کے بعد صحافت سے وابستگی اختیار کی۔ اپنے آبائی گاؤں سے لاہور آنے کا تذکرہ ''مثنوی تاج دین معراج دین'' میں یوں کیا ہے۔

میں لکھنے سے پہلے یہ کرتا ہوں طئے
یہ اُنیس سو تیس کا ذکر ہے
یہاں سے میں پہنچا ہوں لاہور میں
سمجھ لیجئے انگریز کے دور میں
میں ہوں اور پنجاب کے زندہ دل
وہ رخشندہ چہرے وہ تابندہ دل
میں گھر سے نکل آیا بازار میں
سمجھ لیجئے کوٹ اور شلوار میں
(''انداز بیاں اور'')

ریڈیو اسٹیشن کی کشش نے انہیں دہلی کی طرف کھینچا۔ یہاں سے ان کے ذوق سلیم نے انہیں فلمی دنیا تک پہنچا دیا اور تقسیم ملک کے بعد وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ راجہ صاحب گھر سے بزرگوں کی اجازت کے بغیر نکل پڑے تھے اسی وجہ سے ان کے والدین بھائی بہن وغیرہ ان سے ناراض تھے حالانکہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ راجہ صاحب چونکہ ہندوستان میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ان کا پاکستان آنا جانا بھی نہ رہا اور ملک کے حالات بھی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ پاکستان آنا جانا اتنا آسان نہ تھا۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ کیساتھ صرف ایک مرتبہ اپنے وطن گئے تھے۔ پھر اس کے بعد صرف خط و کتابت ہی کا سلسلہ رہا۔ راجہ صاحب کے انتقال

کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

راجہ مہدی علی خاں کا ذریعہ معاش ان کی فلمی شاعری تھی۔ وہ فلمی گیتوں کا معاوضہ بہت کم لیتے تھے اور اس معاملے میں وہ سخت تھے لیکن کسی کو بخشتے نہ تھے۔ پروڈیوسروں کی بے رحمی اور سنگدلی، فنکاروں کے معاوضوں کی ادائیگی میں لاپرواہی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک فنکار کی مجبوریوں کا احساس بھی سامنے آتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ راجہ صاحب باوجود اپنی مجبوریوں کے اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خود ان کی طبیعت کی سادگی فطری اور خاندانی تھی۔ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے۔ کبھی ان کی پیشانی پر بل نہ پڑا اور نہ کبھی ان کے چہرے پر الجھنوں کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ ہمیشہ خوش و خرم رہا کرتے تھے۔ ہنسنا ہنسانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنی بیماری کے دنوں میں بھی ظرافت سے باز نہ آتے تھے۔ نرسنگ ہوم کے ملازم نرس، ڈاکٹرس وغیرہ سے بلا تکلف مذاق کیا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ لوگ ان سے گھل مل جاتے تھے۔ رام لعل اپنی رپورتاژ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ

''ایک کن جسٹیڈ چار منزلہ اسپتال، دوسرے فلور پر ایک نرس نے رہنمائی کی۔ میں.... دستک دے کر سامنے جا کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ دروازہ تو پہلے سے ہی کھلا ہے۔ ایک پلنگ پر چند خواتین بیٹھی ہنس رہی ہیں۔ دائیں طرف دوسرے پلنگ پر دو میل نرس ایک بے حد تنگڑے آدمی کے

بدن کی مالش کرنے میں جٹے ہیں ۔ میں راجہ صاحب کو دیکھتے ہی پہچان گیا ہوں ۔ میرے ہاتھ میں چمڑے کا بیاگ دیکھ کر ایک خاتون (بیگم راجہ مہدی علی خاں) جلدی سے راجہ صاحب کی طرف لپکتی ہے ۔ ''اُٹھیئے اُٹھیئے ! ڈاکٹر صاحب آئے ہیں .....!'' میں کہنا چاہتا ہوں لیکن راجہ صاحب نے زور سے آنکھیں میچ لی ہیں....''میں سو رہا ہوں ۔ ڈاکٹر سے کہدو.......!''

''دیکھیئے تو .... ڈاکٹر صاحب کھڑے ہیں ....!'' وہ قدرے غصہ سے کہہ جاتی ہیں ۔ لیکن راجہ صاحب جواب نہیں دیتے ۔ آنکھیں نہیں کھولتے ۔ زور زور سے خراٹے لینے لگتے ہیں ۔ میں دھیرے سے معذرت خواہ لہجے میں ان کی بیگم کو بتاتا ہوں ۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ۔ میں لکھنو سے آیا ہوں ۔ میرا نام ''اوہ...اوہ... اوہ!'' اب سب خواتین مجسم تاسف بن رہی ہیں ۔ اور راجہ صاحب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے دونوں بازو پھیلا کر ایک عجیب سے ڈھنگ سے روتے ہوئے (جو اس وقت مجھے بڑا مصنوعی لگا تھا) کہہ رہے ہیں ''میرا

دوست آیا ہے لکھنو سے مجھ سے ملنے .... مجھے اٹھاؤ.... ارے کم بختو! مجھے اٹھا کر بٹھا دو کہ اپنے دوست سے گلے مل سکوں۔'' [۱]

اس اقتباس سے واضح ہے کہ راجہ صاحب بستر مرگ پر بھی اپنی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی سے افسردہ ماحول کو بھی خوشگوار ماحول بنا دیا کرتے تھے ۔ سید ناظر حسین عزیز نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے لکھتے ہیں ۔

''راجہ مہدی علی خاں ماہم ہسپتال بمبئی میں زیر علاج تھے ۔ ان دنوں کنہیالال کپور ان کی مزاج پرسی کو وہاں پہنچے ۔ راجہ مہدی علی خاں جو اپنی شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کے لئے مشہور تھے انہیں دیکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا ۔

دو گھڑی آکے ذرا بیٹھیئے بیمار کے پاس
کیوں کبھی آتے نہیں عاشق مکار کے پاس

یہ سنتے ہی کنہیالال کپور جو کھڑے ہوئے تھے ہنستے ہوئے بیٹھ گئے ۔'' [۲]

راجہ مہدی علی خاں جب کوئی عیادت کے لئے افسردہ چہرہ لے کر آتا اُسے مسکرانے پر مجبور کر دیتے اور وہ مسکراتا ۔ راجہ صاحب کو غمزدہ چہرے پسند نہ تھے ۔ وہ ہر ایک چہرے سے

غم کی پرچھائیاں تک نوچ ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسے عظیم کام کیلئے پیدا کئے گئے تھے جو دوسروں کو ہنسانا تھا اور وہ مرتے دم تک اپنا یہ مشن جاری رکھے ہوئے تھے۔

راجہ مہدی علی خاں نے اپنی زندگی میں کسی بھی تحریک سے خود کو وابستہ نہ رکھا خواہ وہ سیاسی ہو یا ادبی جبکہ ان کے ہمعصر شعرا رسیاسی اور ادبی تحریکوں سے وابستہ تھے۔ خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جانثار اختر وغیرہ کمیونزم کے قائل تھے۔ ادبی تحریکوں میں دو بڑی تحریکیں زور وشور سے چل رہی تھیں۔ اور ان تحریکوں کے کسی بھی گروہ سے وابستگی شہرت کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ یعنی ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق راجہ صاحب کا ان دونوں تحریکوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کی اپنی الگ دنیا تھی اور اسی دنیا کے خود راجہ تھے۔ جس میں قہقہوں کے شگوفے ہمیشہ کھلتے رہتے تھے۔ جہاں چاند ہر وقت مسکراتا تھا اور ستارے ان کی کھلنڈرانہ حرکتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

☆☆☆

راجا مہدی علی خاں

A Hameed

راجہ مہدیِ علی خان

دوسری عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بھائی جان ممتاز ملک کو بھی مولانا چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض کے ساتھ فوج کے محکمہ انفارمیشن میں اعزازی کمیشن مل چکا تھا۔ اولڈ سیکرٹریٹ سے ایک "فوجی اخبار" نکلتا تھا۔ حسرت صاحب اور کیپٹن ملک اسی اخبار میں کام کرتے تھے۔

میں تانگے سے اتر کر تیس ہزاری والے اپنے کوارٹر میں پہنچا تو بڑی بہن سمجھ گئی کہ میں ایک بار پھر گھر سے فرار ہو کر نکلا ہوں۔ اس نے تھوڑی بہت ناراضگی کا اظہار کیا۔ زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کی۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے میں وہاں سے بھی بھاگ جاؤں گا۔ تیس ہزاری کے یہ کوارٹر این ٹائپ تھے اور ایک قطار کی شکل میں چلے گئے تھے۔ ہر کوارٹر کے آگے چھوٹا سا برآمدہ اور پیچھے ایک صحن تھا۔ ان کوارٹروں کی حیثیت ادبی اعتبار سے بڑی تاریخی بن گئی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں ان کوارٹروں میں برصغیر کے چوٹی کے ادیب اور شاعر رہ رہے تھے۔ ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں اردو کے نامور افسانہ نگار کرشن چندر رہتے تھے۔ اس سے آگے افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کا کوارٹر تھا۔ اگلے کوارٹر میں عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو رہائش پذیر تھے۔ اس سے آگے منفرد شاعر ن - م - راشد کا کوارٹر تھا۔ اس زمانے میں یہ سب لوگ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔

جب میں وہاں پہنچا تو یہ خبر گرم تھی کہ مشہور طنز نگار شاعر راجہ مہدی علی خان

بھی آ رہے ہیں اور وہ ہمارے کوارٹر کے ایک کمرے میں سکونت اختیار کریں گے۔ ان سب ادیب شاعروں کی شکلوں سے میں واقف تھا۔ امرتسر کی میونسپل لائبریری میں بیٹھ کر ادب لطیف اور جہازی سائز کے رسالے ادبی دنیا میں ان کی تخلیقات کا باقاعدہ مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ان سب شاعر ادیبوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہ ایک بڑا بے مثال حسن اتفاق تھا کہ اردو کے اتنے بڑے بڑے ادیب ایک جگہ اکٹھے رہ رہے تھے۔ یہ ایک تاریخی بات تھی۔ اوپندر ناتھ اشک جس کوارٹر میں رہتا تھا وہ ہمارے کوارٹر سے آگے تیسرا کوارٹر تھا۔ شام کو اس کے بلند قہقہوں کی آواز اکثر سنائی دیتی - اس نے دلی میں آ کر کوشیلا نامی لڑکی سے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ چھوٹے قد کی بڑی گھریلو خاتون تھی۔ کوشیلا کسی دفتر میں ملازمت کرتی تھی اور اوپندر اشک اسے روزانہ صبح سائیکل پر چھوڑنے جاتا تھا۔ کوشیلا سے اشک کی شادی کی داستان کو افسانے کی شکل میں اشک نے اپنے افسانے "کوارٹر نمبر سات" میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔

ہمارے کوارٹر کے سامنے بھیروں جی کا ایک چھوٹا سا پرانا مندر تھا۔ یہاں صبح شام ہندو عورتیں آرتی پوجا کو آتیں اور گھنٹیوں کی آواز میں سنائی دیا کرتی تھیں۔ ان کوارٹروں کے بارے میں کرشن چندر نے بھی ایک افسانہ لکھا تھا جس کا نام "بھیروں جی کا مندر" ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے اتنے سارے ادیبوں کے ایک جگہ اکٹھے مل بیٹھنے کی روئیداد لکھی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ کرشن چندر ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں رہتا تھا مگر میں اسے وہاں ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھ سکا۔ صرف ایک بار آل انڈیا ریڈیو میں ن م راشد صاحب کے کمرے میں اسے دیکھا۔

اوپندر ناتھ اشک بڑا کنجوس تھا۔ اس کی کنجوسی کے اس کے دوستوں میں بڑے چرچے ہوتے - منٹو اور راجہ مہدی علی خان اسے آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ مجھے خواب کی طرح یہ منظر یاد ہے۔ اوپندر ناتھ اشک نے اپنے کوارٹر میں چائے پر سب ادیبوں کو بلایا تھا۔ میں بھی بھائی جان کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ راشد صاحب، منٹو، راجہ مہدی

علی خان اور کرشن چندر اور ایک دتہ صاحب ہوا کرتے تھے وہ بھی وہاں موجود تھے۔ کمرے کی دیوار پر زنانہ ریشمی سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ منٹو نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اشک بڑا کمینہ ہے۔ یہ ریشمی سوٹ یہاں اس لئے لٹکا رکھے ہیں اس نے کہ ہم پر رعب پڑے کہ اس کی بیوی کے پاس اعلیٰ قیمتی سوٹ ہیں۔"

راجہ مہدی علی خان نے اس محفل میں اشک کی کنجوسی کا ایک فرضی واقعہ گھڑ کر سنایا تھا۔ اس کے سوا مجھے اس یادگار محفل کی اور کوئی بات یاد نہیں رہی۔

جس روز راجہ مہدی علی خان ہمارے کوارٹر میں رہنے کے لئے آئے میں گھر پر نہیں تھا۔ دلی شہر کی آوارہ گردی کو نکلا ہوا تھا۔ شام کو واپس آیا تو بھائی جان کے پاس برامدے میں ایک گول مٹول موٹی گردن والا آدمی بیٹھا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کوئی پہلوان لگا۔ بھائی جان نے میرا تعارف کروایا اور معلوم ہوا کہ یہ راجہ مہدی علی خان ہے۔ راجہ صاحب آل انڈیا ریڈیو دلی میں ملازم ہو کر آئے تھے۔ دلی آتے ہی انہوں نے ایک نئی سائیکل خریدی۔ یہ سائیکل ہمارے کوارٹر کے ایک کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ شام کو میں سائیکل نکال کر تیس ہزاری کے علاقے کی سڑکوں پر مٹر گشت کو نکل جاتا۔ راجہ مہدی علی خان میرے ساتھ بڑی شفقت کا سلوک کرتے۔ اس زمانے میں میرا جسم بھاری تھا۔ وہ بھی مجھے پہلوان کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ ایک روز مجھے بڑی رازداری سے کہنے لگے۔

"ریڈیو سٹیشن کے پاس جو میڈن ہوٹل ہے اس کے باہر فٹ پاتھ پر ایک انگریز عورت پان بیچتی ہے۔"

میں علی پور روڈ سے کئی بار گذرا تھا مگر مجھے وہاں کبھی کوئی ایسی عورت نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو راجہ مہدی علی خان نے فوراً کہا۔

سائیکل پر بیٹھو۔ میں ابھی چل کر تمہیں دکھاتا ہوں۔ میں تو روز اس سے پان خریدتا ہوں" انہوں نے مجھے سائیکل پر بٹھایا اور علی پور روڈ کی طرف چل پڑے۔

میڈن ہوٹل کے باہر سائیکل روکی اور ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہ دیکھو انگریز عورت جو پان بیچتی ہے۔"

میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ پر دیوار کے ساتھ ایک انتہائی کالی کلوٹی مدراسی عورت پان سگریٹ کی چھابڑی سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ راجہ صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"کیوں؟ ہے نہ پوری انگریز عورت!"

راجہ مہدی علی خان افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کو بہت تنگ کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ اس کی کنجوسی کو نشانہ بنا کر اسے چھیڑتے۔ اوپندر ناتھ اشک خالص ہوشیار پوری لہجے میں صرف یہی کہتا۔

"تیں باز نہیں آئے گا راجیا؟"

مجھے معلوم نہیں کہ یہ لہجہ ہوشیار پوری تھا یا جالندھری - مگر اشک پنجابی اسی لہجے میں بولتا تھا۔

ایک خوشگوار شام کا ذکر ہے اور یہ شام میری یادوں کے جھروکوں میں اسی طرح روشن ہے۔ میری بہن اور کوشلا سیر کرنے کوارٹروں سے نکلیں۔ میں بھی راجہ کی سائیکل پر بیٹھا ان کے ساتھ تھا۔ کبھی سائیکل زور سے چلاتا ان سے آگے نکل جاتا اور کبھی ان کے ساتھ ساتھ سلو موشن میں سائیکل چلاتا چلا جاتا۔ ہم بڑی سڑک پر آئے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا تو اوپندر ناتھ اشک کی بیگم کوشلا نے رک کر آپا سے کہا۔

"پان تم ہم گھر پر ہی بھول آئے"

آپا کے پاس بڑا خوبصورت ایک پاندان ہوا کرتا تھا۔ وہ پان کھانے کی عادی تھیں۔ بات یہ ہوئی کہ آپا نے پان لگا کر نعمت خانے پر رکھے اور ساتھ لے جاتے وقت بھول گئیں۔

آپا نے مجھے گھر جا کر پان لانے کا آرڈر دیا۔ میں نے پیڈل پر ایک پاؤں کا سارا بوجھ ڈالا اور لہراتا ہوا سائیکل چلاتا ہوا سے باتیں کرتا کوارٹر پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ راجہ مہدی علی خان برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے -

"اچھا تو پہلوان تم لے جاتے ہو شام کو میری سائیکل۔ اب میں تم سے اس کا کرایہ وصول کروں گا"

جب میں نے انہیں بتایا کہ میں پان لینے آیا ہوں تو وہ ہنس کر کہنے لگے۔

"ارے پہلوان! وہ پان تو میں کھا گیا ہوں چلو کوئی بات نہیں۔ میں خود پان لگا کر دیتا ہوں"

راجہ صاحب کچن میں گئے۔ اپنی پھولی ہوئی ہتھیلی پر باری باری پان رکھ کر کتھا چونا لگایا اور دونوں پان کاغذ میں لپیٹ کر مجھے دیئے اور کہا۔

"یہ لو پہلوان! مگر سائیکل آرام سے چلانا"

میں پان لے کر چل پڑا۔ جب تک راجہ صاحب کی نظروں میں رہا سائیکل بڑے آرام سے چلاتا رہا۔ جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے میں نے سپیڈ پکڑ لی اور ہوا سے باتیں کرتا بیگم اشک کے پاس پہنچ گیا۔

دلی میں میرا کام شہر کی آوارہ گردی کرنا اور فلمیں دیکھنا تھا۔ سٹیشن کے ایک قریبی سینما گھر میں کار دار کی ایک فلم لگی جس کا نام میں بھول گیا ہوں۔ اس میں نرملا اور ارون نے کام کیا تھا ارون کو فلم میں کام کرتے دیکھ کر میرے دل میں ایکٹر بننے کی جو چھپی ہوئی خواہش تھی وہ ایک بار پھر بیدار ہو گئی۔ ویسے بھی دلی کی آوارہ گردی سے میرا دل بھر گیا تھا۔ میں نے بڑی بہن سے کچھ پیسے لئے اور ایک روز فرنٹیئر میل میں سوار ہو کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ ریل گاڑیوں میں زیادہ رش نہیں ہوا کرتا تھا۔ فرنٹیئر میل کے ڈبے سبز رنگ کے ہوتے تھے جو مجھے بہت پسند تھے۔ بارش میں یہ ریل گاڑی ہرے بھرے کھیتوں اور جنگلوں سے گذرتی تو مجھ پر وارفتگی سی طاری ہو جاتی۔ گاڑی دلی سے چلی تو نئی دلی کے سٹیشن پر تھوڑی دیر کو رکی - پھر نظام الدین پر رکنے کے بعد جو چلی تو طوفان میل کی رفتار سے چلتی متھرا پہنچ گئی۔ پھر آگرہ کینٹ - پھر گوالیار - اس کے بعد جھانسی ...... بھوپال کا سٹیشن کہیں رات کو آیا۔ رات بھر ٹرین جنگلوں، کھیتوں، درباروں پہاڑی علاقوں اور بستیوں کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھتی چلی

گئی۔ پو پھٹ رہی تھی کہ کھنڈو کا سٹیشن آگیا۔ کھنڈو اسٹیشن پر میں نے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر بھوساول ناسک اور دیولالی سے نکلتی ہوئی فرنٹیئر میل اگت پوری جاکر رک گئی۔

آگے کچھ چڑھائی تھی۔ ٹرین کے پیچھے بھی ایک بجلی کا انجن لگا دیا گیا۔ کافی دیر بعد ٹرین بمبئی کے مضافات میں داخل ہو گئی۔ کلیان' دادر اور پھر بمبے سنٹرل کا سٹیشن آ گیا۔ بمبئی میں میرا کوئی جاننے والا نہیں تھا لیکن اس بات کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ میں فاقے بھی کر سکتا تھا اور فٹ پاتھ اور ریلوے پلیٹ فارموں پر بھی سوتا رہا تھا۔ مقصد صرف ایڈونچر اور نئے نئے شہر نئے نئے لوگ دیکھنے سے تھا۔ اس بار تو میں ایکٹر بننے کا پکا ارادہ کر کے دلی سے چلا تھا - آدمی سفر پر نکل پڑے تو کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جاتا ہے - چنانچہ اس دفعہ بھی ایک لڑکے سے ملاقات ہو گئی جو اندھیری میں واقع پرکاش سٹوڈیوز میں کام کرتا تھا۔ چھ سات روز پرکاش سٹوڈیوز کے چکر لگاتا رہا۔ چھوٹی عمر تھی' بھلا میں کیسے ایکٹر بن سکتا تھا۔ اس سٹوڈیو میں مس پرمیلا' کامیڈن آغا' گلاب اور دوسرے کئی فلمی اداکاروں کو دیکھا۔ شوٹنگ کا تھکا دینے والا عمل دیکھ کر دل سے ایکٹر بننے کا خیال غائب ہو گیا۔ اب شہر کی آوارہ گردی کو نکل کھڑا ہوا۔ دن بھر شہر کی لمبی لمبی سیریں کیں' رات کو اپنے مسلمان دوست کی کھولی کو خیر باد کہا اور بمبے ایکسپریس میں سوار ہو کر واپس دلی روانہ ہو گیا۔

نئی دلی کے سٹیشن پر اتر کر پیدل ہی میدان اور کچے ٹیلوں میں سے ہوتا ہوا تیس ہزاری کے کوارٹروں میں نکل آیا۔ میں چھوٹے سے ٹیلے سے اتر کر اپنے کوارٹر کی طرف آ رہا تھا کہ راجہ مہدی علی خان پر نظر پڑی۔ وہ سائیکل کوارٹر سے نکال کر دفتر جا رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو رک گئے - انہیں پتہ چل گیا تھا کہ بمبئی ایکٹر بننے گیا ہوا ہوں۔ اس زمانے میں پنجاب سے جو بھی خوش شکل لڑکا گھر سے بھاگ کر بمبئی جاتا لوگ یہی سمجھتے کہ وہ فلمی اداکار بننے گیا ہے۔ راجہ مہدی علی نے مجھے دیکھتے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔

"آ گئے ہو پہلوان ایکٹر بن کے؟"

مجھے ان کی یہ بات بڑی بری لگی۔ غصے سے منہ پھلائے میں اپنے کوارٹر میں گھس گیا۔

ان ہی دنوں رجہ مہدی علی خان کی شادی کی بات شروع ہوئی۔ راجہ صاحب کی شادی لکھنؤ میں طے پائی تھی۔ یہ شادی میرے سامنے نہیں ہوئی۔ بارات تمیں ہزاری والے کوارٹروں ہی سے گئی تھی اور بڑی بہن اور بھائی جان ایک طرح سے بارات لے کر لکھنؤ گئے تھے۔ مگر یہ سب کچھ میرے بعد ہوا۔ میں دلی سے کلکتے کی طرف نکل چکا تھا۔ لیکن جب شادی کی بات چل رہی تھی تو میں وہیں تھا۔ راجہ صاحب کو میری بڑی بہن پر اعتماد تھا۔ ایک روز میرے سامنے انہوں نے بڑی بہن سے کہا۔

"آپا! آپ لوگوں نے میری شادی کی بات تو شروع کر دی ہے مگر ذرا غور کرو میری اس سور ایسی موٹی گردن کے ہوتے ہوئے مجھ سے کون لڑکی شادی کرے گی"

میں کسی مبالغے سے کام نہیں لے رہا۔ یہ باتیں میرے سامنے ہوئی تھیں جو باتیں جو منظر مجھے یاد ہوتے ہیں وہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ مجھے یاد رہتے ہیں۔ اس وقت بھائی جان یعنی کیپٹن ملک بھی وہاں موجود تھے جن کی راجہ سے بڑی بے تکلفی تھی۔ بھائی جان نے کہا۔

"تو اس سور کی گردن کو کچھ گھٹاؤ"

دوسرے دن سے راجہ مہدی علی خان نے روزانہ صبح کی سیر اور ورزش شروع کر دی۔ تمیں ہزاری میں ہی ایک آموں کا باغ تھا۔ راجہ مہدی علی خان صبح صبح سائیکل پر وہاں سیر کرنے جاتے' سائیکل ایک طرف رکھ کر گردن کو دائیں بائیں ہلا کر ورزش کرنی شروع کر دیتے۔ ڈنڈ بیٹھکیں بھی نکالتے۔ میں ان کے ساتھ ہوتا کیونکہ صبح کی سیر کا میں بچپن ہی سے عادی تھا۔ راجہ کا سانس بہت جلد پھول جاتا کیونکہ وہ بھاری بدن کے تھے' پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہتے۔

"پہلوان! یہ ورزش تو بڑی مہنگی پڑے گی' گردن پتلی ہونے کی بجائے کہیں اور

زیادہ موٹی نہ ہو جائے"

چھ سات دن ورزش کرنے کے بعد راجہ صاحب نے بھائی جان سے صاف صاف کہہ دیا۔

"ملک یار یہ کام مجھ سے نہیں ہوتا' میں اپنی گردن کا منکا نہیں تڑوانا چاہتا۔ لڑکی والوں سے کہہ دو کہ اگر سور کی گردن قبول ہے تو ہم بارات لے کر آ جائیں گے"

بھائی جان نے یہ بات ن م راشد کو بتا دی اور کہا کہ راجہ کی گردن نے پتلی ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ بات منٹو' اشک اور کرشن چندر کو بھی معلوم ہو گئی۔ انہوں نے مل جل کر راجہ کی گردن کی شان میں دو تین شعر گھڑ ڈالے جو مجھے آج بھی یاد ہیں ۔

راجہ کی گردن ..... بھینسے کی گردن
بھینسے کی گردن ...... راجہ کی گردن
گینڈے کی گردن ...... راجہ کی گردن
گردن کی گردن ...... راجہ کی گردن

لیکن اسی گردن کے باوجود راجہ کی شادی ہو گئی اور سنا ہے بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔

دوسری بار دلی آیا تو راجہ مہدی علی خان شادی شدہ تھے اور ابھی تک دلی ریڈیو پر ہی ملازمت کرتے تھے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا آخری روز تھا۔ راجہ صاحب پہلے سے زیادہ موٹے ہو گئے تھے اور گردن بھی کافی موٹی ہو چکی تھی۔ میں ریڈیو سٹیشن راشد صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ راجہ صاحب نمودار ہوئے۔ مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے ۔

"پہلوان! تم تو بڑے ہو گئے ہو"

پھر مجھے ساتھ لے کر ریڈیو سٹیشن کی کینٹین پر آ گئے۔ چائے پلائی اور کچھ سٹاف

رٹسٹوں سے بھی ملوایا جن میں سے مجھے ایک ہری چند چڈھہ اور ایس ایس ٹھاکر
ن دھندلی سی شکلیں یاد رہ گئی ہیں۔ ٹھاکر کو وہاں تھری ایس ٹھاکر کے نام سے پکارا جاتا
تھا۔ یہ بڑے کمال کے رامہ آرٹسٹ تھے۔ بعد میں اخلاق احمد دہلوی سے ان لوگوں کے
بارے میں بے حد دلچسپ باتیں سنیں۔ ان دنوں ریڈیو سٹیشن پر زیب نام کی ایک
رامہ آرٹسٹ خاتون تھیں۔ بعد میں انہوں نے فلم ایکٹر شیام سے شادی کر لی تھی۔
مجھے یاد ہے زیب صاحبہ نے چوخانوں والا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ راجہ مہدی علی نے
کہا۔

"یہ ملتانی کھیس کا کون ہے"

میں کچھ روز دلی میں رہا پھر برما کی طرف چل دیا۔

اس کے بعد راجہ مہدی علی خان سے پھر ملاقات نہ ہوئی۔ راجہ صاحب وہاں سے
بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا میں شاعری شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے فلمی
گیت برصغیر میں گونجنے لگے۔ وہ بڑے خوبصورت ادبی گیت اور غزلیں فلموں کے لئے
لکھ رہے تھے۔ انہوں نے گاڑی بھی لے لی تھی۔ فلمی دنیا کا مشہور کامیڈین محمود ان کا
ڈرائیور تھا۔ ایک بار اپنے انٹرویو میں کامیڈین محمود نے کہا تھا کہ میں نے اپنی فلمی
زندگی کا آغاز راجہ مہدی علی خان صاحب کی ڈرائیوری سے شروع کیا اور وہی مجھے
ی دنیا میں لائے تھے - حالانکہ محمود کے والد خود فلمی دنیا کے بہت بڑے رقاص
کامیڈین رہ چکے تھے۔ مگر محمود نے اعتراف کیا کہ میں راجہ صاحب کے پاس بطور شوفر
لازم تھا اور ان ہی کی وساطت سے مجھے ایک فلم میں چھوٹا سا رول ملا تھا۔ اس کے بعد
محمود نے اپنی خداداد قابلیت کے باعث بہت ترقی کی اور بہت شہرت کمائی۔

راجہ مہدی علی خان کو قیام پاکستان کے بعد صرف ایک بار پردہ سیمیں پر دیکھا۔
سعادت حسن منٹو ان دنوں ابجے ٹاکیز سے وابستہ تھے جس کا نام فلمستان ہو گیا تھا۔ منٹو
نے "آٹھ دن" نام کی ایک فلم لکھی جس میں کچھ شاعروں ادیبوں نے بھی تھوڑا تھوڑا
کام کیا تھا۔ افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک نے ایک پروہت کا رول ادا کیا۔ خود سعادت

حسن منٹو نے بھی "آٹھ دن" میں ایک نیم خبطی آدمی کا بڑا اہم کردار ادا کیا اور حیرانی کی بات ہے کہ بے حد کامیاب رہے۔ اسی فلم میں ایک بار شاعر میراجی بھی تھوڑی دیر کے لئے پردہ سیمیں پر نمودار ہوئے۔ شاید انہیں لیٹر باکس میں خط ڈالتے دکھایا گیا تھا۔ اس فلم میں راجہ مہدی علی نے باقاعدہ ایک کردار ادا کیا تھا۔ ان کا ایک سین مجھے آج بھی یاد ہے۔ راجہ صاحب عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ وہ گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ جج صاحب پوچھتے ہیں۔

"کیا تمہارے پاس بندوق تھی؟"

راجہ صاحب جواب دیتے ہیں۔

"جناب! تھی بھی اور نہیں بھی تھی"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" جج صاحب تعجب سے پوچھتے ہیں، راجہ مہدی علی خان کہتے ہیں۔

"جناب! بندوق تھی اس لئے کہ تھی اور نہیں تھی اس لئے کہ خالی تھی"

سعادت حسن منٹو نے اس میں بڑے کمال کے مکالمے لکھے تھے۔ راجہ مہدی علی خان اپنی شہرت کے عروج پر تھے کہ ایک روز اخبار میں خبر چھپی کی راجہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کا چہرہ، ان کا مسکرانا، صبح کی ورزش اور سائیکل چلانا، سب کچھ یاد آ گیا۔ مگر صرف یاد کر لینے سے کون واپس آتا ہے!

۱۹۹۷ء فلم رائٹرس ایسوسی ایشن بمبئی کی جانب سے بعد از مرگ فلمی گیت نگار راجہ مہدی علی خاں کو ایوارڈ عطا کیا گیا۔ محترمہ طاہرہ راجہ ساتھ تھیں۔
بیگم راجہ مہدی علی خان او۔ پی۔ نیّر کے ہاتھوں ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے

راجہ مہدی علی خاں ان کی اہلیہ طاہرہ سلطانہ مختفیؔ اور بھانجے خالد صدیقی